ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی

اخلاق محمد ﷺ

قرآن حکیم کے آئینے میں

﴿۲﴾

رسالت سے پہلے ''صلح'' کی دائمی قدر

نبیٔ اکرم ﷺ کے بچپن اور لڑکپن کی زندگی ہی میں آپ کے وہ اخلاق اور خصائص اُبھر کر سامنے آ گئے تھے جن سے آپ کو اپنے معاشرے میں جداگانہ اور مختلف صفات کا حامل سمجھا جانے لگا۔ عرب اگرچہ ایک ایسے وجود کو مانتے تھے جو خالق اکبر تھا، لیکن اُس کے کارِ تخلیق اور اختیارات میں اُنہوں نے ساجھے دار اور شریک بنا لئے تھے۔ اُن کے بت ہی اُن کے معبود بن چکے تھے۔ انہی سے اپنی حاجت روائی کی دعائیں مانگی جاتیں، انہی کی قسمیں کھائی جاتی ہیں، ان ہی کے نام پر قربانیاں کی جاتیں، ان ہی کے آستانوں پر شگون لئے جاتے۔ نوعمر محمد (ﷺ) نے اپنی زندگی کے کسی حصے میں (بچپن اور لڑکپن کے بھی تو مرحلے ہوتے ہیں) کسی بت کے سامنے سر نہیں جھکایا اور انتہا تو یہ ہے کہ آپ کو بتوں کی قسم تک سننا گوارا نہ تھا۔ آپ نے بچپن اور لڑکپن میں بھی ایسے کھیل نہیں کھیلے جن پر ''لغو'' کی اصطلاح کا اطلاق ہو سکے۔ آپ کے لڑکپن میں صرف دو مواقع ایسے آئے جن میں دوسرے نوعمروں کے ساتھ آپ ﷺ نے تفریحی تقریبات میں شرکت کرنے کا ارادہ کیا۔ ایسی راتیں جن کو قبیلے والوں اور سب گھرانوں کی اجتماعی تفریح کی راتیں کہا جا سکتا ہے، لیکن دونوں مرتبہ آپ نیند کے غلبے کی وجہ سے اُن تفریحوں میں شریک نہیں ہوئے۔ ہمارا ربّ اپنے رسولوں کی زندگی کے ہر لمحے کو سنوارتا اور چمکاتا ہے۔ اور انبیاء کو ان معمولی باتوں سے بھی بچاتا ہے، جو اگرچہ اُن کے معاشرے میں معروف کا درجہ رکھتی ہیں، لیکن اُن کے مرتبۂ عالیہ کے مطابق نہیں ہوتیں۔ انبیاء رسل کی پوری زندگیاں ایک لمحۂ حاضر کی طرح اُن کے رب کے سامنے ہوتی ہیں۔ یہ بات عام انسانوں کی سمجھ میں اُن کے اعلانِ رسالت کے بعد کی زندگی کے مطالعے سے آتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ انسانیت کے لئے صلح کے سب سے بڑے نقیب اور پیغام بر تھے۔ صلح کو اس کے وسیع ترین مفہوم میں دیکھئے، جس میں عام انسانوں کی اصلاح بھی شامل ہے۔ اس میں عام انسانوں کی کمیوں اور خامیوں کو دور کرنے کا عمل بھی داخل ہے، اور یہ اصلاح فرد اور معاشرے میں توازن قائم کرنے سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ جنگ کے مقابل صلح کا لفظ اسی مفہوم کو اُجاگر کرتا ہے۔ زندگی، جنگ کے عالم میں اپنے توازن سے محروم ہو جاتی ہے۔ گھر اُجڑ جاتے ہیں، بستیاں پامال ہو جاتی ہیں، زندگی اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتی ہے اور عزت و آبرو کے گہر پیروں تلے روندے جاتے ہیں۔ انبیائے کرام کو اسی توازن کے برقرار رکھنے کے لئے جنگ بھی کرنا پڑتی ہے اور اُس وقت تک کہ قرآنِ حکیم کے بیان کے مطابق جنگ اپنے ہتھیار نہ ڈال دے۔ نبی کریم ﷺ کی زندگی اور قرآنِ حکیم کی تعلیمات کے گہرے مطالعے سے یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ اعمالِ صالحہ سے مراد ایسے عمل ہیں جن سے دنیا کا توازن برقرار رہ سکے، معاشرے کی، خاندان کی اور افراد کی زندگی متوازن بن سکے، اور انسان کو نفس مطمئنہ حاصل ہو سکے۔

سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۲۸ میں صلح کا لفظ اگرچہ میاں بیوی کے تعلقات کو خوش گوار بنانے کے سلسلے میں ادا ہوا ہے مگر اس سے ہمیں ایک دائمی قدر حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ

وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ط (۱)

صلح بہت اچھی چیز ہے۔

اس دائمی قدر سے انسان کی زندگی کا توازن برقرار ہے۔ یہ آیت چار فقروں پر مشتمل ہے اور ہر فقرہ اپنے دامن میں ایک اصول اور حکم رکھتا ہے۔ دوسرے اور تیسرے فقروں میں انسانوں کو ایک دائمی قدر یعنی صلح عطا کی گئی ہے اور انسانی فطرت کی اُس کمزوری کو پیش کر دیا گیا ہے جو صلح کے دامن کو بار بار چاک کرتی ہے:

وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوزًا أَوْ إِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ط وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ط وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ ط وَإِنْ تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا O (۲)

اگر عورت کو اپنے شوہر کی بدمزاجی اور تغافل و بے پروائی کا اندیشہ ہو تو اس میں کوئی گناہ نہیں کہ وہ باہمی صلح کر لیں، صلح بہت بہتر ہے اور لالچ (خود غرضی) ہر نفس (انسان) میں شامل ہے اور اگر تم اچھا اور احسان کا سلوک کرو گے اور

تقویٰ کو اپناؤ گے تو اللہ تمہارے عمل سے پوری طرح باخبر ہے۔

اس آیت کو ایک طویل اور واضح جملے یا آئین کی دفعہ کی طرح پڑھیے۔ اس دفعہ (جملے) کی پہلی شق یہ ہے کہ میاں بیوی باہمی صلح کے ہر امکان سے فائدہ اُٹھائیں اور اگر ایک فریق زیادتی (بدمزاجی، تغافل) کا شکار ہو تو بھی دوسرے کو معاف کر دے اور خوشگواری کے ساتھ زندگی گزارنے کی صورت نکالے۔

اس کے بعد دوسری شق (فقرے) میں یہ فرمایا گیا کہ الصلح خیر صلح بہت بہتر بات ہے۔ یہ وہ دائمی قدر اور اُصول ہے جو قرآنِ کریم نے انسانیت کو عطا کیا ہے۔

تیسری شق (فقرے) میں اُس سبب کی نشان دہی کی گئی ہے جو انسان کو صلح کے راستے سے ہٹا دیتا ہے اور فساد، نزاع، جھگڑے اور جنگ کا سبب بنتا ہے۔ یہ طمع اور لالچ ہے جو انسان کے خمیر میں شامل ہے۔ انسان اپنے مفادات اور فائدے کے لئے ہر اُصول، ضابطے اور انسانی طرزِ عمل کو چھوڑ دیتا ہے۔ یہ بات افراد کے ساتھ ساتھ اقوام کے بارے میں بھی درست ہے۔ قومیں اپنے مفاد اور اغراض کے لئے ظلم اور زیادتی پر تیار ہو جاتی ہیں بلکہ آمادہ رہتی ہیں۔ دوسروں کی زمین چھین لو، دوسرے کے حصے کا پانی روک دو، دوسرے کے وسائل کی راہ میں رکاوٹ بن جاؤ، ہمیں آج یہی عالمی طمع ہر خطۂ ارض میں نظر آتی ہے۔

اور چوتھی شق یہ ہے کہ اس فطری کمزوری کو خوفِ الٰہی کی مدد سے دور کیا جا سکتا ہے، اور آج افراد اور اقوام میں اگر کچھ نہیں ہے تو تقویٰ نہیں ہے۔ آج کا خود غرض انسان عاقبت کے خیال اور عدل کے تصور سے بے نیاز ہے۔

اس عظیم آیت کے پس منظر میں نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر نظر ڈالئے۔ ہر ظلم اور زیادتی کا غیر معمولی پامردی سے مقابلہ کرتے ہوئے آپ نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ بات اس طرح سلجھ جائے کہ ہر فریق کو اُس کا حق مل جائے اور جنگ کا خطرہ ٹل جائے۔ آج دُنیا کے ہر خطے میں یا تو جنگ ہو رہی ہے یا جنگ کی فضا ہے کیونکہ آج انسان ربانی پیام سے دُور ہو گیا ہے۔ فلسطینیوں سے اُن کے علاقے چھین لئے گئے ہیں، عراق اور افغانستان، امریکہ اور اُس کی حلیف قوتوں کے قدموں تلے روندے جا رہے ہیں، ہندوستان نے کشمیر میں ہر انسانی قدر کو پامال کر رکھا ہے۔

ان سب باتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے اخلاق اور اس سلسلے میں اُن کی تعلیمات پر نظر ڈالئے تو عالمِ انسانیت اور انسانوں کے مستقبل پر آپ ﷺ کے احسانات کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ مکی دور میں وہ کون سا ستم ہے جس کا آپ ﷺ اور اہلِ ایمان کو نشانہ نہیں بنایا گیا اور جب اپنے

اللہ کے کرم سے آپ ﷺ نے وقت اور تاریخ کے دھارے کو پلٹ دیا، تو حرمِ کعبہ نے مغلوب قریش مکہ کے ہجوم سے آپ کے اس خطاب کو سنا کہ لاتثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء (۳)

صلح کا منبع..... بے غرضی اور خیر خواہی

صلح، بے غرضی کے جذبے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور بے غرضی خیر خواہی کے جذبے سے جنم لیتی ہے۔ ہر رسول اور خاص طور پر ہادیٔ اعظم نوعِ بشر ﷺ کا قلبِ مبارک خیر خواہی کا سرچشمہ تھا۔ نبوت ہے ہی بے غرضی کا دوسرا نام اور بے غرضی بھی اور خیر خواہی بھی اس درجے کی کہ آپ ﷺ کی راتیں گمراہوں کی ہدایت کے لئے اشک فشانی میں گزر جاتیں اور آپ کے مقدس آنسو ہدایت کے ستارے بن کر فضاؤں اور دلوں کی دُنیا کو جگمگا دیتے۔ حیاتِ قبلِ نبوت میں آپ ﷺ کی بے غرضی اور خیر خواہی آپ کے ہر عمل میں مکے والوں کو نظر آتی۔ آپ کی نرم گوئی اور قولِ حسن باہمی رنجشوں کو محبت میں بدل دیتا۔ نبوت سے پہلے ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ اُسے آپ ﷺ کی نبوت کا خیر مقدمی نغمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ (ﷺ) کی حیاتِ مبارکہ کا پینتیسواں سال تھا کہ خانۂ کعبہ کی پرانی بنیادوں پر کعبے کی نئی تعمیر کا فیصلہ کیا گیا۔ پرانی عمارت بوسیدہ ہو چکی تھی اور اُس کے منہدم ہونے کا اندیشہ تھا۔ ابھی قریش میں حرمِ کعبہ کے بارے میں اتنی اخلاقی حس باقی تھی کہ اُنہوں نے طے کیا کہ کعبے کی تعمیرِ نو میں حلال اور محنت کی کمائی صرف کی جائے گی۔ دوسروں سے چھینی ہوئی دولت، سود کا روپیہ اور حرام ذرائع سے حاصل کی ہوئی دولت استعمال نہیں کی جائے گی۔

بنیادِ ابراہیمیؑ پر تعمیر شروع کی گئی۔ یا قوم نامی ایک رومی ماہرِ تعمیرات، تعمیری کاموں کا نگراں مقرر ہوا۔ تمام قبائل کے لئے کعبے کی سمت اور جگہ مقرر کر دی گئی اور دیوارِ کعبہ بلند ہونے لگی، یہاں تک کہ اتنی بلند ہوگئی کہ حجرِ اسود کو نصب کرنے کا مرحلہ آ گیا۔ وہ قبیلے جو مل جل کر تعمیر میں حصہ لے رہے تھے، ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ ہر قبیلہ اس اعزاز کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کئی دن بحث و تکرار میں گزر گئے اور پھر نوبت یہ آ پہنچی کہ تلواریں نیام سے باہر نکلنے کے لئے بے قرار ہوگئیں۔ فضا اتنی کشیدہ ہوگئی کہ معقولیت نے دم توڑ دیا اور مفاخرت نے ہر منطق اور ہر عقلی فیصلے پر غلبہ پالیا۔ اتنے میں کسی نے یہ مشورہ پیش کیا کہ کل صبح جو شخص سب سے پہلے مسجدِ حرام میں داخل ہو تو اُس کو حَکَم بنا دیا جائے اور سب اُس کے فیصلے کو تسلیم کر لیں۔ یہ فیصلہ سب نے قبول کر لیا۔

یہ فیصلہ کرنے والے ساری رات حرم میں رہے۔ اور جب صبح کو کائنات بیدار ہونے والی تھی تو مسجدِ حرام کے دروازے سے حرم میں وہ داخل ہوا جسے دیکھ کر سب پکار اُٹھے:

ھٰذا الامین رضیناہ، ھٰذا محمد (۴)

یہ امین ہے، ہم اس پر راضی ہو گئے، یہ محمد ہے۔

یہ تھے عبدالمطلب کے پوتے، عبداللہ کے لختِ جگر، ابو طالب کے بھتیجے، خدیجہؓ طاہرہ کے زوج، جن کو باطل میں غرق معاشرہ بھی ''امین'' اور ''صادق'' کہنے پر مجبور تھا۔

صلح قائم کرنے کے لئے خیر خواہی اور بے نفسی کے علاوہ غیر جانب داری بھی درکار ہے کہ یوں ہی ہر فریق مطمئن ہو سکتا ہے۔ محمد (ﷺ) کی خدمت میں معاملہ پیش کیا گیا اور آپ نے اللہ کے عطا کردہ نورِ برہانی کی روشنی میں ایک چادر منگوائی۔ اُس کے درمیان حجرِ اسود رکھا گیا۔ چادر کے کونوں کو تمام قبیلوں کے نمائندوں نے پکڑ کر اُٹھایا۔ اور جب حجرِ اسود کی جگہ تک یہ لوگ پہنچے تو اس حَکَم نے پتھر کو اُٹھا کر اُس کی جگہ پر لگا دیا۔ یوں ایک بڑا فساد دم توڑ گیا اور قبائل قریش ایک ایسی جنگ سے بچ گئے کہ اگر وہ چھڑ جاتی تو کئی نسلوں تک جاری رہتی۔

تجارت.....امانت کا ایک وسیلہ

نبیٔ اکرم ﷺ بچپن اور لڑکپن میں بکریاں چرانے کے بعد تجارت کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ ﷺ نے پہلا تجارتی سفر اپنے چچا جناب ابو طالب کے ساتھ کیا۔ آپ شام تشریف لے گئے تھے۔ قرآنِ مجید میں سیروا فی الارض (۵) کی ترغیب بار بار دی گئی ہے۔ اس سفر میں بارہ سالہ محمد (ﷺ) نے کئی مقامات اور شہروں کو دیکھا، لوگوں کی عادات و اطوار کا مشاہدہ کیا، گزشتہ مغضوب قوموں کے مساکن اور دیار سے گزرے۔ آپ کو ساری انسانیت کے لئے رسول ہونا تھا تو دوسرے علاقوں سے یوں آپ کا تعارف کرایا گیا۔ ان میں رومی سلطنت کے مقبوضہ علاقے بھی تھے۔ جب ہم آپ کے ''تاجرانہ اخلاق'' کے بارے میں گفتگو کریں گے تو سیر و سیاحت کی اہمیت اور تجارت سے اُس کے رشتے کو زیرِ بحث لائیں گے۔ اسی سفر میں بحیرا راہب سے آپ ﷺ کی اتفاقیہ ملاقات کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ روایت بہت مستند نہیں ہے، اور اسی مبیّنہ ملاقات پر مستشرقین نے اپنے اس نظریے کی عمارت کھڑی کر لی ہے، کہ اسی ملاقات میں آپ ﷺ کو زبور و انجیل کی تعلیمات کا علم ہوا، اور انہیں روایات کو آپ نے معاذ اللہ قرآن

میں استعمال کیا۔ اوّل تو آپ کی عمر بارہ سال کی تھی اور پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ چند گھنٹوں کی ملاقات میں آپ تورات وانجیل کے عالم ہوگئے، اور ایک حرف ناشناس لڑکے نے کس طرح ان یہودی اور عیسائی روایات میں اخذ وانتخاب کے عمل سے کام لے کر ایک صحیفہ مکمل کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ بحیرا نے مشورہ دیا کہ محمد (ﷺ) کو بصریٰ سے وطن واپس بھیج دو، ورنہ شام میں یہودیوں کے ہاتھوں جان کا خطرہ ہے، اور جناب ابوطالب نے چند معتبر آدمیوں کے ساتھ آپ کو واپس بھیج دیا۔ (۶)

اگر اس واقعے میں صداقت ہوتی تو چچا آپ کو چند سال بعد تجارتی سفرِ شام کی اجازت کیسے دیتے؟۔ قریش تو تجارت پیشہ تھے۔ نوجوان محمد (ﷺ) نے قریش کے تجارتی قافلوں کے ساتھ تجارتی سفر شروع کردیا۔ آپ لوگوں کا تجارتی سامان لے کر جاتے اور سامان فروخت کرکے سامان کے مالکوں سے معاوضہ حاصل کرتے۔ تجارت سے آپ کی دیانت، امانت اور حساب میں کھرے ہونے کی شہرت اور محکم ہوگئی۔ آپ کی ان اخلاقی صفات کو مشہور اور مستحکم کرنے میں تجارت نے بڑا حصہ لیا۔

آپ ﷺ کی دیانت اور معاملہ فہمی کی شہرت سن کر ایک مشہور اور مالدار تاجر خاتون خدیجہ بنتِ خویلد نے آپ ﷺ کو اپنا تجارتی نمائندہ مقرر کیا۔ خدیجہؓ ایک معزز بیوہ خاتون تھیں۔ کردار ایسا پاکیزہ تھا کہ عہدِ جاہلیت میں بھی اہلِ مکہ اُنہیں طاہرہ کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ پچیس سالہ محمد (ﷺ) خدیجہؓ کا مالِ تجارت لے کر اُن کے غلام میسرہ کے ساتھ شام کے تجارتی سفر پر روانہ ہوگئے۔ اس سفر میں (حضرت) خدیجہ (رضی اللہ عنہا) کو ایسا منافع ہوا جس میں دیانت اور حسنِ معاملہ کے ساتھ آپ کی ذات کی برکت کا فیض بھی شامل تھا۔ خدیجہؓ پر آپ کی ایمانداری، صداقت، احساسِ امانت اور معاملہ فہمی کا ایسا اثر ہوا کہ اُنہوں نے اپنے آپ کو محمد (ﷺ) سے شادی پر آمادہ پایا۔ خدیجہ نے اپنی سہیلی نفیسہ کے ذریعے آپ تک پیغام پہنچایا اور آپ ﷺ نے ساری بات سے اپنے چچاؤں کو مطلع کیا۔ خدیجہ کی شرافت ونجابت سے مکّے میں کون واقف نہ تھا۔ کتنے ہی مالدار اور معزز سردارانِ قبیلہ آپؓ سے شادی کی تمنّا رکھتے تھے۔ جناب ابوطالب نے پیغام منظور فرمالیا اور خود خطبۂ نکاح پڑھا۔ یوں دو شخصیتیں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئیں۔ محمد (ﷺ) کی عمر اُس وقت پچیس سال تھی، اور خدیجہؓ زندگی کی چالیس بہاریں دیکھ چکی تھیں۔ بعض قابلِ توجہ روایات کے مطابق اُس وقت آپ ﷺ کی عمر اٹھائیس سال تھی۔ یہ شادی آج تک انسانی تاریخ میں ایک مثالی شادی کا درجہ رکھتی ہے، جس میں دو روحیں مل گئیں اور دو دل ایک طرح دھڑکنے لگے۔ ازدواجی اخلاق کے باب میں ہم اس شادی کے متعلقہ نکات کا ذکر کریں گے،

ان شاء اللہ۔ حضرتِ خدیجہ رضی اللہ عنہا، سب سے پہلے ایمان لائیں۔ حضور ﷺ مسلم اول ہیں اور مسلم ثانی خدیجہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ ازدواجی زندگی اخلاق کی بنیاد باہمی اتفاقِ رائے اور تعاون کی اخلاقی قدر ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اخلاق کا ہر پہلو ایک اخلاقی صحیفے کا درجہ رکھتا ہے۔ اعتماد ہی ازدواجی زندگی کو جنتی زندگی کا دیباچہ بناتا ہے۔ حضرتِ خدیجہؓ دین کے راستے میں نبیٔ اکرم ﷺ کے دوش بہ دوش کھڑی رہیں اور آپ کی تسکین اور تسلی کا موجب بنیں۔

رسول اللہ ﷺ جب پہلی وحی کے بعد گھر تشریف لائے تو اس عظیم تجربے کا بوجھ آپ کی ذاتِ مبارکہ پر بہت شدید تھا۔ اُس وقت حضرتِ خدیجہؓ نے آپ کو تسلی دی۔ یہ تسلی بھی آپؐ کے اخلاق کی بنیاد پر تھی۔ اسلام کی خاتونِ اوّل نے یہی فرمایا کہ آپ ﷺ کو آپ کا اللہ کبھی رُسوا نہیں کرے گا۔ اُس کی نصرت و اعانت آپ کے ساتھ رہے گی کیونکہ آپ ﷺ رشتوں کی پاسداری کرتے ہیں اور صلۂ رحمی آپ کا شعار ہے۔ آپ بے سہاروں کا سہارا ہیں، اور اُن کا بارِ درماندگی آپ کے کاندھے اُٹھاتے ہیں، آپ غریبوں کی دست گیری کرتے ہیں، مہمانوں کی تکریم اور تواضع کرتے ہیں اور جو صحیح راستے پر ہیں اُن کی اعانت کرتے ہیں۔ (۷)

یہ بات کتنی اہم ہے کہ آپ کی رسالت کی تصدیق کرنے والی پہلی شخصیت نے آپ ﷺ کے دعویٰ کی دلیل آپ کے اخلاق کو بنایا۔ وہ جس کی صداقت کی گواہی اُس کا معاشرہ دیتا تھا، وہ جس کی امانت ضرب المثل تھی، وہ اپنے اللہ پر کیسے بہتان باندھ سکتا تھا۔ تصدیقِ خدیجہ اخلاقِ محمد ﷺ کی بلندی کی گواہی ہے اور وہ بھی ایک ایسی ذات کی زبان سے، جو آپؐ سے سب سے زیادہ قریب تھی، جس پر آپؐ کا ظاہر و باطن پوری طرح آشکار تھا۔

اقرأ اور پھر قم

نبیٔ اکرم ﷺ پر جو پہلی وحی نازل ہوئی وہ تھی: اقرا باسم ربک الذی خلق (۸) ایک حرفِ ناشناس کو پڑھنے کا حکم دیا جا رہا ہے، اور تخلیقِ آدم کے اسرار و رموز اُس پر فاش کئے جا رہے ہیں۔ اُس اُمی لقب کے وسیلے سے علم کی عظمت اور حقیقی ماہیت ''فاش'' کی جا رہی ہے۔ وہ علم جو ہمیں بتاتا ہے کہ کائنات بالحق پیدا کی گئی۔ اخلاق کی عمارت اسی علمِ یقین کی بنیاد پر استوار ہو سکتی تھی۔ نبیٔ اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے اخلاق معاشرے کی رسوم، بالادست طبقے کی عادات اور توہمات اور معاشرے

کے رہن سہن کا دوسرا نام تھا۔ یہ بات عرب تک محدود نہ تھی بلکہ ہر معاشرے میں اخلاق کا تعین اُس کے سربرآوردہ، بااثر اور پڑھے لکھے کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ انسانوں کا تناظر، دائرۂ فکر محدود تھا۔ یونان کے عظیم فلسفیوں کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ غلامی کا ادارہ انسانیت کی تذلیل ہے۔ اُنہوں نے نہ غلاموں کو معاشرے میں عادلانہ اور باعزت جگہ دلانے کی کوئی کوشش کی، اور نہ اس ادارے کو بتدریج ختم کرنے کے بارے میں کچھ سوچا۔ رسول اللہ ﷺ کو جو اخلاق اور اخلاقی اقدار عطا کی گئیں، اُن کا سرچشمہ وحیٔ الٰہی تھا۔

سورۂ اقرأ کی ابتدائی پانچ آیتوں کے نزول کے بعد نزولِ وحی کا سلسلہ کچھ عرصے کے لئے رُکا رہا۔ اس زمانے کو زمانۂ فترتِ وحی کہا جاتا ہے۔

معتبر روایات کے مطابق اس کے بعد پہلی نازل ہونے والی سورت المدثر ہے۔ المدثر میں کئی اخلاقی ضوابط بیان کئے گئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسالت کے بنیادی مقاصد میں سے تزکیۂ نفس اور اصلاحِ اخلاق بھی ہے۔ آیات کی تلاوت، تزکیۂ قلوب اور کتاب وحکمت کی تعلیم کسی بھی رسول اور خاص طور پر حضرتِ محمدِ عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فرائضِ نبوت میں اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔

سورۂ المدثر میں مدثر (ﷺ) سے فرمایا گیا کہ اب تنذیر کے ذریعے فریضے کی تکمیل کے لئے کمربستہ ہو جایئے اور اپنے رب کی عظمت و کبریائی کا اعلان کیجئے۔ اس کے فوراً بعد فرمایا گیا:

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝ (۹)

اپنے کپڑوں کو پاک رکھئے، اور گندگی سے دور رہیے، اور احسان کر کے بہت بدلے کے خواہش مند نہ ہوئیے، اور اپنے رب سے اُمید رکھیے (اور اس کے لئے صبر کیجیے)

ان تین آیات میں طہارت اور پاکیزگی کا لفظ وسیع ترین معانی میں استعمال ہوا ہے جو انسانی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کر لیتا ہے۔ ثیاب، ثوب کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں کپڑے۔ انسان کے اعمال، اُس کا ظاہر ہوتے ہیں اور جس طرح آدمی اپنے لباس سے پہچانا جاتا ہے اُسی طرح اپنے اعمال سے۔ اسی لئے محاورۂ عرب میں ثوب کا لفظ عمل اور انسانی فعل کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ظاہری افعال کے علاوہ ثوب کے مجازی معانی میں قلب اور اخلاق بھی شامل ہیں۔ تقویٰ کو اسی لئے قرآن مجید میں بہترین لباس قرار دیا گیا ہے:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (۱۰)

یابنی آدم! ہم نے تمہارے لئے لباس نازل کیا (پیدا کیا) جو تمہاری شرم گاہوں کو چھپاتا ہے اور تمہارے لئے باعثِ زینت بھی ہے۔ اور تقویٰ کا لباس۔ یہ تمام لباسوں سے بہتر ہے، یہ اللہ کی آیات میں سے ہے، تاکہ یہ لوگ یاد رکھیں۔

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اس قرآنی حکم کو اس کے وسیع ترین سیاق وسباق میں سمجھنا ہوگا۔ لباس کی پاکیزگی کے بعد گندگی سے دور رہنے کا حکم دیا گیا۔ اس سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہ رجز لباس کی، جسم کی ظاہری نجاست نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی نجاست، خطا اور گناہ اس میں شامل ہے۔ حضور ﷺ کی خلقت ہی معصومیت پر مبنی تھی۔ اللہ نے ہر گناہ سے آپ کو محفوظ کر دیا تھا، اس لئے ادنیٰ تامل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ حکم آپ کو مخاطب کر کے مسلمانوں کو دیا جا رہا ہے۔ قرآنِ مجید کا یہ عام اسلوب ہے۔ حضور ﷺ کے قول یا عمل سے حکم کا اثبات قوی تر ہو جاتا ہے۔ قل ھو اللہ احد پر غور کیجئے۔ اللہ کے احد ہونے کے بیان سے پہلے ''قل'' کی کیا ضرورت تھی؟ ضرورت تھی اور اس لئے کہ رسالت احدیتِ رب کو یوں جانتی تھی جیسا کہ جاننے کا حق تھا۔ یہ حقیقت رسول کے لئے عین الیقین کے درجے پر تھی۔ آئمہ تفسیر نے رجز سے مراد بت پرستی لی ہے۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کبھی کسی بت کے آستانے پر سر نہیں جھکایا۔ سورۃ المدثر میں بتوں کے چھوڑ دینے سے مراد ہر دور میں مسلمانوں کے لئے اس حکم کی تاکید ہے۔ اس پر اضافہ کیجئے ہمارے عہد میں غیر مرئی بتوں کی یلغار ہے، وہ بت جو دل ونگاہ میں اپنے استھان سجائے ہوئے ہیں۔ اقتدار کا بت، سرمایہ پرستی کا بت، کبر ونخوت کے بت۔ انہیں بتوں کی موجودگی میں عہدِ حاضر اور آنے والے ادوار کے مسلمانوں کو لا الٰہ الا اللہ کا حکم دیا گیا ہے:

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ

اور ان احکام پر عمل کرنے کا نسخہ ''صبر'' ہے وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۔ اُردو میں تو صبر مجبوری کا دوسرا نام ہے، لیکن قرآنی صبر ضمیرِ کائنات کو بدل کر، مسخر کر کے اُسے مومن بنا دیتا ہے:

صبر کے لفظی معنی اپنے نفس کو روکنے اور قابو میں رکھنے کے ہیں، اس لئے صبر کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی پر اپنے نفس کو

قائم رکھے اور یہ بھی داخل ہے کہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے نفس کو روکے۔ اور یہ بھی داخل ہے کہ مصائب اور تکلیف میں اپنے اختیار کی حد تک جزع نزع اور شکایت سے بچے، اس لئے یہ حکم ایک جامع حکم ہے جو تقریباً پورے دین کو شامل ہے۔(۱۱)

رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والی وحی اہل مکہ بلکہ عالم انسانیت کے لئے بہت عظیم نعمت تھی اور اُسے انسانوں تک پہنچانا بہت بڑا احسان، لیکن کارِ نبوت تو انتہائی بے غرضی کا مطالبہ کرتا ہے، اسی لئے آپ ﷺ کو رسول بنا کر بھیجنے والے نے یہ ہدایت واشگاف انداز میں فرمائی کہ احسان کر کے انسانوں سے بدلے کے خواہش مند نہ ہوئیے گا، آپ کا اجر تو آپ کے ربّ کے پاس ہے، اور اُسی سے اجر اور کامیابی کی اُمید رکھیے گا۔

بعثت کے پہلے تین سال آپؐ نے خاموشی کے ساتھ قریبی عزیزوں اور حلقۂ احباب میں تبلیغ فرمائی۔ قریبی دوست اور عزیز کسی شخص کے ظاہر و باطن، اخلاقی کیفیت، صداقت، دیانت، امانت اور معاملہ فہمی سے سب سے زیادہ باخبر ہوتے ہیں۔ یہ بھی آپ کی صداقت کی پہلی دلیل اور سچائی کا معجزہ ہے کہ پہلی وحی کے نزول کے پہلے ہی دن آپ ﷺ سے سب سے قریب لوگ مسلمان ہو گئے۔ سب سے پہلے حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ ایمان لائیں۔ آپ ﷺ کی زندگی کی شریک، آپ کی خلوت و جلوت کی رفیق، آپ کی نرم دلی، خیر خواہی مخلق، اور بے پایاں وسعتِ قلب کی شاہد۔ حضرت علی المرتضیٰؓ جو آپ کے گھر میں آپ کے زیرِ نگرانی پرورش پا رہے تھے اور جو اپنے چچیرے بھائی کو اپنا آدرش سمجھتے تھے اور اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کو وجہِ سعادت جانتے تھے، اُن کو ایک لمحے کا تأمل بھی قبولِ اسلام میں نہ ہوا۔ وہ اگرچہ بہت کم عمر تھے اور ابھی اُنہیں لڑکپن سے نوجوانی کی حدود میں داخل ہونے میں کئی سال درکار تھے مگر ہاشمی استقلال، اصابتِ رائے اور ذہنِ رسا کے مالک تھے۔ ان ہی اولین حلقہ بگوشانِ اسلام میں زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، جو رسول اللہ ﷺ کے غلام تھے، جن کی زندگی کی ہر سانس آپ کی محبت کی امانت دار تھی۔ اس آسمان نے ایسی کوئی مثال نہ پہلے دیکھی تھی اور نہ بعد میں دیکھی کہ زید کے والد اور چچا اُنہیں لے جانے کے لئے آئے۔ انسان کو ہر زنجیرِ غلامی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آزاد کرنے والے ہادی، رہبر (ﷺ) نے اُنہیں جانے کی بخوشی اجازت دے دی، لیکن زید اپنے محسن، اپنے مربی اور اپنے آقا کو چھوڑ کر جانے پر رضامند نہیں ہوئے۔ وہ تو رسول اللہ ﷺ کو دیکھ کر جیتے تھے۔ اسی محبت کے پیشِ نظر

رسول اللہ ﷺ نے اُنہیں آزاد کر کے اپنا متبنیٰ (منہ بولا بیٹا) بنایا اور وہ زید بن محمد کہے جانے لگے۔ یہاں تک کہ تبنیت کے رواج کو اسلام نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ ان ہی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں۔

حضرت صدیقؓ کے فضائل اقبال کے اس شعر میں سمٹ آئے ہیں:

ہمتِ او کشت ملت را چو ابر
ثانیٔ اسلام و غار و بدر و قبر

وہ آزاد مردوں میں سب سے پہلے اسلام لانے والے تھے، ہجرت کے وقت وہی رفیقِ نبی ﷺ تھے، غارِ ثور میں دو افراد (نبی و صدیق) میں سے ایک تھے، اور وفات کے بعد آپ رسول اللہ کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے محوِ خوابِ ابد ہیں۔

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ، سرورِ کائنات ﷺ کے سب سے گہرے اور قریبی دوست تھے۔ اس دوستی کی بنیاد عادات و خصائل اور اخلاقِ حمیدہ کی یکسانیت تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق مکہ کی نہایت بااثر، بارسوخ اور محترم شخصیات میں سے تھے۔ علانیہ تبلیغ کے دور کے آغاز سے پہلے ہی اُن کی تبلیغ کے نتیجے میں حضرت عثمان غنی، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہم مسلمان ہو گئے تھے۔ کفر کے سمندر میں ایمان کے یہ جزیرے اُبھر آئے تھے۔ کفر کے گلیشیر پگھلنے لگے تھے۔ ان مسلمان ہونے والوں میں حضرت بلالِ حبشی، حضرت ابوعبیدہ بن جراح، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عمرِ فاروق کی بہن فاطمہ بنتِ خطاب اور حضرت خباب بن ارث رضی اللہ عنہم اور بعض دوسرے صحابۂ کرامؓ بھی شامل ہیں۔

''سابقین اولین'' یہ پہلے مسلمان ہونے والے اس مرتبے اور سعادت میں بدرجۂ اولیٰ شامل ہیں۔ قرآنِ کریم کے اوراق ان کے علوئے مرتبہ کے شاہد ہیں۔ اللہ کے فضل اور نبی محترم ﷺ کی رحمت کا کوئی ٹھکانا ہے کہ سابقین الاولین میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔ ان میں مکہ معظمہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والے بھی شامل ہیں اور اسلام قبول کرنے والے اولین انصاری بھی شامل ہیں جنہیں پہلی بیعتِ عقبہ اور دوسری بیعتِ عقبہ میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ

تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ (۱۲)

اور جو مہاجرین اور انصار میں سابق اور مقدم ہیں، اور جو لوگ احسان اور اخلاص کے ساتھ اُن کے متبع ہیں، اللہ اُن سب سے راضی ہوا، اور وہ سب اللہ سے راضی ہوئے، اور اللہ نے اُن کے لئے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، اور ان باغات میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ بے شک بڑی کامیابی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اُس نے ان کے لئے جنت کے باغات تیار کر رکھے ہیں اور جنت اُن کے لئے ہے جن کی بشری کوتاہیاں اور گناہ رب العزت معاف کر دے اور اُن کے حسنات قبول فرمالے۔ ایک گروہ جو اپنے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یہ بھی عقیدہ رکھتا ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ کے وصال کے بعد چھ سات صحابیوں کے علاوہ معاذ اللہ معاذ اللہ سارے صحابۂ کرامؓ مرتد ہو گئے تھے۔ قرآنِ کریم کی اس واضح اور مستقل بشارت کے بعد ایسا عقیدہ صریح کفر ہے۔

سب سے پہلے مسلمان ہونے والے مہاجرین اور انصار تو سابقون الاولون میں شامل ہیں ہی۔ آئمہ تفسیر نے شرکائے بدر کو سابقون الاولون میں شامل کیا ہے۔ بعض اکابر کی رائے میں بیعتِ رضوان میں شرکت کرنے والے صحابۂ کرام بھی اسی جماعتِ سعادت و برکت میں شامل ہیں۔ راقم الحروف کے ذہن اور دل کی یہ گواہی ہے (اور خدا نہ کرے کہ یہ تفسیر بالرائے ہو) کہ کسی کافر معاشرے میں پہلے ایمان لانے والے سابقون الاولون میں شامل ہوں گے، کیونکہ اُمتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا سلام والصلوٰۃ) خیر الامم ہے۔ اور اس کے حدود و آفاق میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا ہے اور نئے نئے علاقے دائرۂ اسلام میں شامل ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ اور سابقون الاولون کا اتباع کرنے والوں کو گروہِ تابعین کہا گیا ہے اور یہ گروہ ان شاء اللہ تا قیامِ قیامت دینِ اسلام پر خلوص اور احسان کے ساتھ عمل کرتا رہے گا۔

نیکیوں اور سعادتوں میں آگے بڑھ کر حصہ لینے والوں کا سلسلہ ان شاء اللہ جاری رہے گا، اگرچہ ان کی تعداد زمانۂ رسالت کے لوگوں کے مقابلے میں کم ہوتی جائے گی۔ نیکوکاروں اور نیکیوں کے حصول میں سبقت کرنے والوں اور سبقت لے جانے والوں سے ہی ہر دور میں پیغامِ رسولِ عربیؐ پھیلتا رہے گا، اسلام کا چراغ روشن رہے گا۔

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۙ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۚ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ○ ثُلَّةٌ

مِنَ الْاَوَّلِیْنَ ۙ وَقَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ ۝ (۱۳)

اور جو (نیکیوں میں) آگے والے ہیں وہ تو آگے والے ہی ہیں۔ وہ مقامِ قربت پر فائز ہیں، نعمتوں والی جنتوں میں۔ ان سابقون الاولون میں ایک بہت بڑا گروہ اگلے لوگوں میں سے ہوگا، اور تھوڑے سے لوگ بعد میں آنے والوں میں سے۔

ان شاء اللہ سابقون الاولون کی کیفیت، مختصر واقعات اور حالات متعلقہ حصۂ کتاب میں پیش کئے جائیں گے، جن کی مدد سے اُن کے اخلاق کا بیان روشن تر، واضح تر ہو سکے گا۔

صبر.....مومن کی ڈھال

رسول اللہ ﷺ نے اپنے عمل اور اپنی استقامت سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو حق کی سربلندی اور صراطِ مستقیم پر چلنے کے سلسلے میں صبر کا سبق سکھایا۔ صبر، اسلامی اخلاق کا عنوانِ جلی ہے۔ استقامت، توکل علی اللہ اور تواصوا بالحق کا حاصلِ جمع صبر ہے۔ صبر انسان کو وہ قوت عطا کرتا ہے کہ ہر ناوکِ ستم انسان سے ٹکرا کر ٹوٹ جاتا ہے۔

مکۂ معظمہ میں جو لوگ سب سے پہلے مسلمان ہوئے اُن میں غلام اور پس ماندہ طبقے کے لوگ بھی شامل تھے۔ تاریخِ رشد و ہدایت اس حقیقت پر شاہد ہے کہ پیغامِ حق کو سب سے پہلے وہ قبول کرتے ہیں جن کے پاس کھونے کو کچھ نہیں ہوتا اور پانے کو جنت، اچھی زندگی، آزادی اور اگلی دُنیا پر یقین ہوتا ہے اور پیغامِ حق کی مخالفت میں وہ خوش حال طبقہ سب سے آگے ہوتا ہے جس کے مفادات پر رسول کا پیغام سب سے زیادہ ضرب لگاتا ہے۔ ربانی پیغام استحصال اور انسان کی غلامی سے انسان کو نجات دلاتا ہے۔ یہ مترفین اس کچلے ہوئے طبقے کو ظلم و جبر کا نشانہ بناتے ہیں اور وہ صبر کی قوت سے باطل کی طاقت اور نشے میں چُور ان جابروں کو شکست دے دیتا ہے۔ بلال رضی اللہ عنہ کو گرم ریت پر گھسیٹا جاتا ہے اور سینے میں تپتی ہوئی چٹان رکھ دی جاتی ہے مگر اس کے جواب میں اُن کے لبوں سے اَحد، اَحد کی صدا بلند ہوتی رہتی ہے۔ اپنی جگہ پر ڈٹ کر کھڑے رہنے کا عمل صبر ہے، اور اس صبر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ صابر، ظالم کو اپنی جگہ سے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

قریبی عزیزوں کو دعوتِ اسلام دینے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو تبلیغِ عام کا حکم دیا گیا۔ تبلیغ

عام کی اجازت کے ساتھ ہی مکی معاشرے میں بھونچال آیا۔ رسول اللہ کا تمسخر اُڑایا جانے لگا۔ آپ کو طرح طرح سے جسمانی، ذہنی اذیتیں دی جانے لگیں۔ مختصر الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ تاریخِ انبیائے عظام دُہرائی جانے لگی، لیکن رسولِ کریم ﷺ کے رفقا تو ایک دوسری ہی دنیا میں بس رہے تھے۔ وہ دُنیا جو نبی ﷺ کے اخلاق اور کردار کی روشن دُنیا تھی۔ کفار کے نزدیک اگر دینِ حق جرم تھا تو ان قدسی نفس انسانوں کا ''ذوقِ جرم'' سزا کے بعد بڑھتا چلا گیا، ان حالات میں ربِ جلیل نے اپنے رسول ﷺ کو یوں تسلی دی:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ O اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ O وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ۙ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۙ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ O (۱۵)

پس آپ کو جو حکم دیا جارہا ہے اُس کو کھول کھول کر بیان کیجئے اور مشرکوں سے اعراض کیجئے (اُن سے منہ پھیر لیجیے) آپؐ سے تمسخر کرنے والوں (کی سزا) کے لئے ہم کافی ہیں۔ جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبودوں کو شریک کرتے ہیں اُن کو جلد ہی (اپنی گمراہی کا نتیجہ) معلوم ہوجائے گا۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ (مشرکین) جو کچھ کہتے ہیں اُن باتوں سے آپ دل تنگ ہوتے ہیں۔ آپ اپنے رب کی تسبیح کرتے رہیں (اور اُس کی) حمد کرتے رہیں اور اُس کو سجدہ کرنے والوں میں شامل ہوجائیں اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہیں یہاں تک کہ آپ کو موت آجائے۔

ان مختصر سی آیات میں کیا کچھ نہیں آ گیا؟۔ پیغامِ رسالت کا خلاصہ، کافروں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے برتاؤ کا رخ، اُلجھنے کی جگہ اُن کو نظر انداز کرنا۔ اُن کے مظالم کی وجہ سے یہ طرزِ عمل (اعراض) کتنا مشکل تھا۔ اور یہ اعراض کسی مجبور کا اعراض نہیں تھا، بلکہ اس کی پہلوتہی کا رویہ تھا جس کا رب اُس کے ساتھ تمسخر کرنے والوں کے لئے کافی تھا۔ اور جلد ہی مشرکوں نے اپنے سر برآوردہ لوگوں کا حشر میدانِ بدر میں دیکھ لیا، اور ابولہب کی عبرت ناک موت بھی اُن کے سامنے آ گئی، یہی فتح مکہ کے موقع پر پوری جماعتِ مشرکین اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے سر جھکائے ہوئے کھڑی تھی۔ ذلت اُن کے لئے

کافی تھی اور رسول اللہ ﷺ کی زبان سے جب ربانی کلمہ لاتثریب علیکم الیوم ادا ہوا، تو یہ اُن کی شکست پر تازیانہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی دل تنگی کے لئے اُن کے رب نے اپنی معیت کا یقین دلانے کے ساتھ ساتھ انشراحِ قلب کا نسخہ بھی عطا کیا۔ وہ تھا تسبیح، حمد اور سجدہ۔ پھر یہ حقیقت بھی سامنے آ گئی کہ یہ صرف نسخۂ تسخیرِ تمسخر ہی نہیں ہے بلکہ آپ کے لئے اور آپ کے ساتھیوں کے لئے طرزِ زندگی ہے۔ وہ اسلوبِ حیات جو موت تک جاری رہے گا۔ ان آیات کی تکمیل سورۂ النصر ہے:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۙ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ (۱۵)

اور جب اللہ کی نصرت اور فتح آ جائے اور آپ لوگوں کو جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیں تو اپنے ربّ کی تسبیح بیان کریں، اور اُس سے مغفرت طلب فرمائیں، وہ بے شک بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

یہ نبیٔ کریم ﷺ کے اخلاقِ عظیم کے کئی پہلوؤں کا بیان ہے جو صبر کے ہم عنان و ہم رکاب ہیں۔ بیانِ حق اور واضح طور پر مشرکوں سے پہلو تہی، استقامت کے ساتھ تمسخر کا مقابلہ، اور اس تمسخر سے دل میں تنگی نہ محسوس کرنا، پھر اس طرزِ زندگی پر مداومت و استقلال، موت تک۔ یوں موت حیاتِ ابدی کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔

ان اخلاقی تعلیمات کو رسول اللہ ﷺ نے اپنا عمل بنالیا اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کی تقلید کی۔ یوں صحابۂ کرامؓ کا اخلاق، اخلاقِ محمدؐ کا پرتو بن گیا اور آج بھی رسول اللہ ﷺ کی سیرت مسلمانوں میں اسی اخلاق کو اپنانے کا حوصلہ پیدا کر رہی ہے۔

یا صباحاہ

حضور ﷺ کی تبلیغ کے تدریجی مراحل سے سیرتِ طیبہ کا ہر طالب علم اور عام مسلمان واقف ہے۔ قریبی رشتے داروں میں تبلیغ کے مرحلے کے بعد جب آپ کو کھول کھول کر بیان کرنے کا حکم دیا گیا تو ایک صبح آپ ﷺ نے کوہِ صفا کی بلندی سے آواز بلند کی۔ یا صباحاہ (ہائے صبح)۔ یہ آواز، قوم کو باخبر کرنے کا نعرہ تھا، جب کسی دشمن کا خطرہ ہوتا تو قریش اسی نعرے سے ایک دوسرے کو اطلاع دیتے۔ یا صباحاہ کی آواز سن کر قریش کے قبیلوں کے افراد آپ ﷺ کے گرد جمع ہو گئے۔ آپ بلندی پر کھڑے

تھے اس لئے آپ کی نظر کے سامنے آپ کی پشت کا منظر بھی تھا اور آپ کے سامنے کا منظر بھی۔ قریش آپ کی صداقت پر مکمل اعتقاد رکھتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں یہ کہوں کہ میری پشت پر دشمن کا ایک لشکر موجود ہے تو تم یقین کرلو گے؟ مجمعے نے جواب دیا کہ ہاں! ہم تمہاری صداقت پر کامل بھروسہ کرتے ہیں۔ اس پر رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ کی حمد بیان کی اور قریش کو توحید اور اپنی رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ اس دعوت پر قریش کے ردعمل کا اظہار ابولہب نے یوں کیا کہ "اے بھتیجے! تمہارا دن غارت ہو۔ تم نے ہمیں اسی لئے جمع کیا تھا۔ یا صباحاہ کے نعرے کو تم نے کس طرح استعمال کیا" یہ کہہ کر ابو لہب وہاں سے چل پڑا، دوسرے لوگوں نے بھی اُس کی پیروی کی۔ ابولہب کے الفاظ یہ تھے:

تبًا لَکَ اَلِھٰذَا جمعتنا (۱۶)

ہلاکت ہو تمہارے لئے، کیا اس کے لئے تم نے ہمیں جمع کیا تھا۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے تبًا لک کا جواب نہیں دیا، لیکن رب ذوالجلال نے اس کا جواب دیا، ایسا جواب، جو ابولہب کی تقدیر بن گیا:

تبت یَدَآ اَبِی لھب وَّتبَّ ○ (۱۷)

ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ ٹوٹ کر رہ گیا۔

ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔ اس کا مفہوم واضح ہے کہ اُس کے منصوبے ناکام ہو گئے۔ اور خود اُس کے ٹوٹ جانے کی خبر، اُس کی ہلاکت کی خبر ہے۔ مستقبل کی یہ خبر، صیغۂ ماضی میں ادا کی گئی جو انتہائی یقین اور قطعیت کا اظہار ہے۔

جب ابولہب نے تبًا کہا تھا تو مسلمانوں کے دلوں میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ سرورِ دین و دنیا ﷺ بھی اُس کے حق میں بددُعا فرمائیں، لیکن جو ذات رحمۃ اللعالمین بنا کر بھیجی گئی تھی، جو کافروں کے ایمان لانے کی تمنا میں دُعا کرتے کرتے اپنی رات کو سحر بنا لیتی تھی، اُس کے لبوں سے بددُعا نہ نکلی۔ تبت یدآ ابی لھب کی بددُعا کلامِ الٰہی کی صورت میں سامنے آئی، اور اس بددُعا کا نتیجہ بھی فرما دیا گیا کہ وَتبّ۔ غزوۂ بدر کے سات دن بعد ابولہب طاعون میں مبتلا ہوا۔ اس موذی مرض کے اثرات سے بچنے کے لئے اُس کے گھر والوں نے اُسے گھر سے باہر پھینک دیا اور اسی عالم میں وہ لقمۂ اجل بنا۔ تین دن تک اُس کی لاش یوں ہی پڑی رہی اور پھر کرائے کے آدمیوں نے اُس کے لاشے کو ایک گڑھے میں ڈال کر اُسے پتھروں سے پاٹ دیا۔

ابولہب کی موت کفر کے انجام کا ایک اشاریہ ہے۔ اُس کی موت کے لئے ربِّ کریم نے جس وقت کا انتخاب فرمایا اُس کی معنویت پر غور فرمایئے۔ بدر کو یوم الفرقان فرمایا گیا۔ حق و باطل بالکل واضح اور الگ ہوگئے اور حق غالب آ گیا۔ ربِّ ذوالجلال نے امام کفر ابولہب کو کفر کا یہ انجام دکھا دیا اور پھر ذاتِ باری اُس کی طرف متوجہ ہوئی اور کفر کے اس نشان کو مٹا دیا۔ اُس کی موت کی عبرت ناکی بھی ایک رمز تھی۔ ایسی رمز جو ظاہر اور واضح ہے۔

اس رمز میں اصحابِ محمد ﷺ کے لئے تویدتھی۔ ابولہب کی موت کے ذکر نے، رسول اللہ ﷺ اور اُن کے اصحاب کی داستانِ صبر و استقامت کے تسلسل کو توڑ دیا مگر یہ ابدی حقیقت اُبھر آئی کہ:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بو لہبی

کافرانہ زندگی کا ہر شعبہ خطرے کی زد میں

قریش، تبلیغ کی ابتدا کے ساتھ ہی اُس تبدیلی کو سمجھنے میں کامیاب ہوگئے جو اس ''نئے دین'' کے نتیجے میں پیدا ہوسکتی تھی۔ اُنہیں دینِ آبا خطرے میں نظر آیا۔ دینِ آبا ہی نہیں بلکہ زندگی کے سارے رسم و رواج، سارے معاشرتی ادارے، اور سب سے بڑھ کر اپنا قبائلی نظام، سماجی احساس تفاخر۔ اُنہوں نے اسلام کی تعلیمات میں انسانی اُخوت و مساوات کے پہلو کو آج کے روایتی مسلمانوں سے بھی زیادہ واضح طور پر موجود پایا۔

اُنہوں نے بجا طور پر اس پہلو کو بھی سمجھ لیا کہ زندگی کے ہر شعبے کو اسلام کے دائرے میں شامل کرنا پڑے گا، چاہے وہ اپنی آمدنی اور اپنی دولت کو خرچ کرنے کا مسئلہ ہی کیوں نہ ہو۔ جیسے جیسے اسلام کا چرچا بڑھا، قریش کی مخالفت بھی بڑھنے لگی۔ افراد اور معاشرے پر اسلام کی ہمہ جہت اور ہمہ گیر گرفت قریش کو قبول نہیں تھی۔

انبیائے سابقین بھی اپنے اپنے ادوار میں اسی اسلام اور نظام کے داعی تھے۔ اسلام کے بنیادی اُصول، احکام اور تعلیمات ہر دور میں چند عصری تقاضوں اور فروعات کے علاوہ ایک ہی رہی تھیں۔ ہر نبی نے توحید، آخرت، دُنیا میں عدل و انصاف، عبادات میں نماز، روزے، انفاق فی سبیل اللہ کی تعلیم دی اور اُن پر ان کی اُمتوں کے اعتراضات اور اُن کی مخالفت کے اسباب بھی یکساں رہے ہیں

جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کفر کا ذہن ہمیشہ سے ''جامد'' رہا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام مدین والوں کی طرف بھیجے گئے۔ ان کی دعوت، تعلیمات اور اُن کی قوم کے روّیے کا ذکر قرآنِ حکیم نے اس جامعیت کے ساتھ کیا ہے کہ ہر دور کے کافروں اور منکروں کا احاطہ کر لیتا ہے:

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ط قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَالَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ط وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْیَالَ وَالْمِیْزَانَ اِنِّیْٓ اَرٰىكُمْ بِخَیْرٍ وَّ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ مُّحِیْطٍ O وَیٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْیَالَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ O بَقِیَّتُ اللّٰهِ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ج وَمَآ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ O قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ط اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ O (۱۸)

اور مدین (والوں) کی طرف ہم نے اُن کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اُنہوں نے (اپنی قوم والوں سے) کہا کہ اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو کہ تمہارے لئے اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اور ناپ تول میں کمی نہ کرو۔ میں تمہیں آسودہ حال دیکھ رہا ہوں اور مجھے تم پر اُس دن کے عذاب کا خوف ہے، جو تمہیں گھیر لے گا۔ اور اے میری قوم! تم انصاف کے ساتھ پوری پوری ناپ تول کرو اور لوگوں کو اُن کی چیزیں (بددیانتی سے) کم نہ دو اور زمین پر فساد نہ مچاتے پھرو۔ اگر تم مومن ہو تو اللہ تعالیٰ کا حلال کیا ہوا جو بچ رہے تمہارے لئے بہت بہتر ہے اور میں تم پر نگہبان اور داروغہ نہیں ہوں۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ اے شعیب! کیا تمہاری صلوٰۃ تمہیں یہی حکم دیتی ہے کہ ہم اُن معبودوں کو چھوڑ دیں جنہیں ہمارے آباواجداد پوجتے تھے اور ہم اپنے مالوں میں بھی ویسا تصرف نہ کر سکیں جو کرنا چاہتے ہیں، تم تو بڑے بردبار اور نیک کردار آدمی ہو۔

ہر نبی عبادات کے ساتھ فرائض واحکام کی تعلیم بھی دیتا رہا ہے۔ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کو رزقِ حلال اور جائز تجارت کا حکم دیا، جس میں ناپ تول کی کمی بیشی نہ ہو، صلوٰۃ سے واضح طور پر مراد نماز

ہے، مگر یہ لفظ وسیع ترین معانی میں پورے دین کے لئے استعمال ہوا ہے، پورا نظامِ دین، جس میں عبادات، معاملات اور فرائض واحکام سب شامل ہیں، خاص طور پر زکوٰۃ وصدقات۔ مشرکوں اور منافقوں پر زکوٰۃ بہت گراں گزرتی ہے، جس کا اندازہ نبیٔ اکرم ﷺ کے وصال کے بعد انکارِ زکوٰۃ کے فتنے سے ہوسکتا ہے۔ یہ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی فراست، ایمان اور استقلال تھا جس نے اس فتنے کی جڑ کاٹ دی ہے۔ (قومِ شعیبؑ کا حضرت شعیب علیہ السلام کو حلیم الرشید کہنا استہزا کی ایک شکل ہے)

جماعتِ مومنین کی شیرازہ بندی

نبیٔ کریم ﷺ کی دعوت وتبلیغ کے ساتھ جماعتِ مومنین کی شیرازہ بندی، اُن کی تعلیم و تربیت اور اُن کو احکام وفرائض کی تعلیم بھی وابستہ ہے۔ ۳ نبوت میں آپ کو کھلم کھلا تبلیغ کا حکم دیا گیا۔ اُس سے پہلے آپ ﷺ نے قریبی عزیزوں کو دعوتِ اسلام دی اور اولین مسلمانوں نے اپنے قریبی دوستوں اور قابلِ اعتماد عزیزوں تک اسلام کا پیغام پہنچایا، یوں مسلمانوں کی تعداد چالیس پینتالیس افراد تک پہنچ گئی۔ یہ اہلِ ایمان ایک دوسرے سے حرمِ کعبہ میں ملتے اور اشاروں، کنایوں میں گفتگو کرتے، پہاڑوں کی گھاٹیوں میں مل بیٹھتے، مل کر نماز پڑھتے اور اپنے ربّ کی عبادت کرتے، باہمی صلاح ومشورہ کرتے، نبیٔ کریم ﷺ کی معیت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی کوشش کرتے، آپ ﷺ سے طہارت اور وضو کے احکام معلوم کرتے اور نماز سیکھتے۔ اسی ابتدائی دور میں سورۃ المدثر نازل ہوئی۔ بہت سی مستند روایات کے مطابق سورۂ اقرأ کی پہلی پانچ آیات کے بعد المدثر سب سے پہلے نازل ہونے والی سورہ ہے جس میں آپ کو تنذیر کے لئے اُٹھ کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا، اپنے رب کی تکبیر بلند کرنے کا فریضہ آپ کے سپرد کیا گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ پاکیزگی کا حکم آپ کو اور جماعتِ مومنین کو دیا گیا اور بت پرستی اور تمام معصیتوں سے اہلِ ایمان کو روکا گیا۔ معاشرتی احکام میں اس بات کو اولیت دی گئی کہ معاوضے کے خیال سے کسی پر احسان نہ کیا جائے اور اس ''نئے'' راستے پر چلنے والوں کو صبر کی تلقین کی گئی اور صبر بھی اپنے رب کے لئے۔ ''صلوٰۃ'' اور ''صبر'' اسی نسخے کو اپنا کر اہلِ ایمان ہر ظلم کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔

نماز ابتدائی دور میں بھی مسلمان برابر اور پابندی کے ساتھ ادا کرتے تھے، اگرچہ پنج وقتہ نمازوں کی فرضیت واقعۂ معراج سے وابستہ ہے۔ نماز جسے سرکارِ عالم و عالمین ﷺ نے ''معراج المؤمنین'' قرار دیا، تحفۂ معراج ہے لیکن یہ بات بڑی حد تک متفق علیہ ہے کہ بالکل ابتدائی دور میں صبح اور

شام کی دو نمازیں فرض قرار دی گئیں اور ان دونوں نمازوں میں دو دو رکعتیں ادا کی جاتی تھیں۔ اس سلسلے میں یہ آیت دلیل کے طور پر پیش کی جاتی رہی ہے:

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَاللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْلِذَنْبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاَبْكَارِ O(۱۹)

اے نبیؐ! آپ صبر کیجئے، بے شک اللہ کا وعدہ حق ہے۔ آپ (اور آپ کے رفقا) اپنی کوتاہی پر استغفار کرتے رہیں اور صبح و شام اپنے ربّ کی تسبیح اور حمد بیان کرتے رہیں۔

نبیٔ اکرم ﷺ معصوم پیدا کئے گئے تھے اور آپ ہر گناہ سے محفوظ و مامون تھے۔ ذنب کے لغوی معانی ہیں ''دُم''۔ اسی لئے اُن تہمتوں کو بھی ذنوب کہتے ہیں جو کسی آدمی کے پیچھے لگا دی جائیں۔ سورۂ فتح میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر اعلان فرما دیا کہ اے رسول! آپ پر جو اتہام پہلے لگائے گئے، یا بعد میں لگائے جائیں گے ہم نے آپ کو اُن سے محفوظ کر دیا اور یہ فتحِ مبین اُس کا ایک ثبوت ہے۔ اور حضور ﷺ کی مستقل مغفرت طلبی شُکر کی ایک صورت ہے۔ صبر اور صلوٰۃ رزمِ حق و باطل میں اور کارگاہِ حیات میں مومن کے وہ ہتھیار ہیں جو اُسے اُس کے رب نے عطا کئے ہیں۔ نماز تو مومن کی اللہ تعالیٰ سے سرگوشی اور کلام ہے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق کا راستہ ہے اور صبر ایک ایسی اخلاقی قوت ہے جو اُسے استقامت عطا کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو جو اخلاقِ عالیہ عطا کئے ہیں اُن میں ہر خُلق دوسری اخلاقی خوبی سے ہم رشتہ ہے۔ صبر کا نتیجہ استقامت ہے۔ استقامت راہِ حق میں ہر قربانی کے لئے تیار کرتی ہے اور مومن میں یہ قربانی اس یقین کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے کہ اُس کا اللہ اُس کے ساتھ ہے۔ یہ تعلق باللہ نماز کے ذریعے مستحکم ہوتا ہے۔ اسی لئے ارشاد ہوا:

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (۲۰)

اور اللہ کی مدد صبر اور صلاۃ کے ذریعے طلب کرو۔

نماز کے حکم سے پہلے صبر کا حکم دیا گیا، اور صبر کی تلقین میں نصرتِ حق کا مژدہ بھی شامل ہے۔ سورۃ العصر ابتدائی قرآنی سورتوں میں سے ہے۔ اس کے اختصار، اس کے معنی اور اس کے احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُسی دور کی سورہ ہے:

وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۲۱)

زمانہ اس حقیقت کا شاہد ہے کہ بے شک انسان خسارے میں ہے، سوائے اُن کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے، اور جنہوں نے ایک دوسرے کو حق کی وصیت کی، اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔

تین آیات کی اس مختصر سورت پر غور کرتے جایئے، انسان کی پوری تاریخ آپ کی نظروں کے سامنے سے زندہ مناظر کی طرح گزرتی جائے گی۔ تاریخِ انسانی اور مصر و نینوا کے کھنڈرات، یونان، ہند کے باقیات اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا۔ بس وہی نقش قائم رہتے ہیں جن کو انبیائے کرام نے وحیٔ الٰہی کی روشنی میں پیش کیا اور جن پر اہلِ ایمان کے ایمان اور عمل کی مہر ثبت ہے۔ ''ایمان'' اور ''عملِ صالح'' کا تعلق افراد کے قلب و ذات سے ہے اور وصیت بالحق اور وصیت بالصبر کا رشتہ اہلِ ایمان کے معاشرے سے ہے۔ بالخصوص سابقین الاولین سے، جو ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کرتے تھے، دُکھ سہتے اور ظلم برداشت کرتے تھے۔ روایات کے مطابق اس دورِ ابتلا و آزمائش میں جب دو مسلمان ایک دوسرے سے ملتے تو اُس وقت تک الگ نہ ہوتے جب تک ایک دوسرے کو سورۂ العصر نہ سنا دیتے۔ یہ تین آیات اُن کے لئے ہدایت نامہ بھی تھیں، اُن کے ایمان کا اعلان بھی، اور اُن کا منشورِ حیات بھی تھیں۔

جب نبیٔ اکرم ﷺ کو قریبی رشتے داروں میں تبلیغِ حق کے بعد کھلم کھلا اسلام کی دعوت دینے کا حکم ملا تو آپ نے اس فریضے کو تنِ تنہا انجام دینا شروع کیا۔ اُس وقت تک ۴۰۔۴۵ افراد حلقۂ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ ان میں پس ماندہ اور کچلے ہوئے طبقے کے افراد بھی تھے۔ کئی مسلمانوں کو کسی قبیلے کی حمایت بھی حاصل تھی۔ نبیٔ اکرم ﷺ کا دل مسلمانوں کے لئے خزینۂ رحمت تھا۔ کسی مسلمان کی ادنیٰ سی تکلیف آپ کو مجسم اضطراب بنا دیتی۔ یہ وہ ذاتِ گرامی تھی جس کے جوتے طائف میں خون آلود ہوئے تھے، اور اس طرح کہ آپ کے تلوے سے چپک گئے تھے۔ اس عالم میں بھی آپ استحکام کے قلعے کی مستحکم فصیل کی طرح کھڑے رہے اور کسی حرفِ شکایت کے بغیر۔ لیکن اسلام کے اس ابتدائی دور میں جب کوئی بے سہارا آپ کے پاس آیا اور اُس نے آپ کے حضور اسلام قبول کیا تو آپ نے کہا کہ اپنے اسلام کو فاش نہ کرو، اپنے وطن واپس جاؤ اور جب سنو کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے غلبہ عطا کر دیا ہے تو ہمارے پاس آ جانا۔

نبی کریم ﷺ کی یہ شفقت، مسلمانوں کے ساتھ آپ کا یہ رحم اور مکمل رافت آپ کے خُلق عظیم کا عجب پہلو ہے۔ آپ کی رافت و رحمت صرف مسلمانوں تک محدود نہ تھی۔ آپ حیوانوں پر شفقت فرماتے۔ بے زبان جانور بھی رسولِ اکرم ﷺ کی اس رحمت کا شعور رکھتے تھے۔ وہ اُونٹ جن کے مالک اُن سے زیادہ مشقت لیتے اور انہیں مناسب غذا نہ دیتے یا انہیں مارتے پیٹتے، رحمتِ عالم ﷺ سے اُن کی شکایت کرتے۔ آپ کا یہ حسنِ سلوک پودوں اور درختوں کے ساتھ بھی تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں ایسی چراگاہوں، سبزہ زار اور باغات کی سرپرستی فرمائی جنہوں نے ماحول کو حسن اور صحت بخشی عطا کی تھی۔ سرکارِ ختمی مرتبت ﷺ کو باغات میں تفریح کی غرض سے کچھ وقت گزارنے کا شوق تھا۔ آپ ﷺ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی آپ کے ساتھ ہوتے۔ تفریح کے ساتھ اُن کی تعلیم اور تربیت کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ یہ آپ کی رحمت اور رحم کا ایسا ماجرا تھا جو اپنی وسعت میں ایک ختم نہ ہونے والا دفتر بن گیا تھا۔ ہم نے حضورِ نبی کریم ﷺ کے اخلاق کے اس مطالعے میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ آپ کی حیاتِ طیبہ کے مختلف ادوار اور اُن ادوار میں واقعات و حالات کے سبب اُبھرنے والی اخلاقی صفات زمانی ترتیب سے آپ کے سامنے آسکیں، لیکن ہادیٔ اعظم ﷺ کی رحمت ہر دور میں نمایاں رہی ہے، اسی لئے ہم اس کا ذکر قدرے تفصیل سے دعوت کے ابتدائی مراحل میں ہی کر رہے ہیں اور یہ داستانِ دل نواز مختلف ادوار میں مختلف اسالیب سے اپنے آپ کو دُہراتی رہے گی۔

سورۃ الحجر مکی سورہ ہے اور اسی میں وہ عظیم آیت ہے جس میں آپ ﷺ کو عام تبلیغ کا حکم دیا گیا:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (۲۲)

پس آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے اُسے کھول کر (واشگاف انداز میں) سنا دیجیے اور مشرکوں سے منہ پھیر لیجیے۔

اس سورہ کی آیات میں قرآنِ عظیم کے دوسرے سوروں کی طرح اندرونی اور معنوی ربط ہے۔ ایسا ربط جو مختلف احکام اور وضاحتوں کو ہم رشتہ کر دیتا ہے، جس نے نبی کریم ﷺ اور اُن کے ذریعے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو زندگی کے حقائق سے روشناس کیا اور اس طرح کہ وہ قرآنِ عظیم کی سات دہرائی جانے والی آیتوں کی نعمت کو پا کر دنیا کی تمام ترغیبات سے بے نیاز ہو گئے۔ اور اُن کی آسودگی قلب کو صرف قرآنی اصطلاح ہی ادا کر سکتی ہے۔ ''نفس مطمئنہ''

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝ لَا تَمُدَّنَّ

عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ○ (۲۳)

یقیناً ہم نے آپ کو سات بار بار دہرائی جانے والی آیتیں اور قرآنِ عظیم عطا کیا ہے۔ آپ اپنی آنکھیں ہرگز اُن چیز کی طرف نہ دوڑائیں (اور اُن کو مرکزِ توجہ نہ بنائیں) جو ہم نے اُن میں سے کئی طرح کے لوگوں کو دے رکھی ہیں اور نہ آپ ان چیزوں کے نہ ہونے پر افسوس کریں اور مؤمنوں کے لئے اپنے بازو جھکا دیجیے (جس طرح پرندے اپنے بچوں کے لئے اپنے بازو پھیلا دیتے ہیں)

اس قرآنی بیان میں مکے کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کی زندگی اور سرورِ کائنات کی درد مندی کا نقشہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ اور یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مشرکوں کو حاصل تمام نعمتیں صرف سورۂ فاتحہ کے سامنے کتنی حقیر ہیں۔ ان سات آیتوں میں اسلام کی روح اُسی طرح سمٹ کر آ گئی ہے کہ جس طرح ہماری آنکھوں کی پتلی میں وسیع آسمان سمٹ کر آجاتا ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ ہماری یہ تشبیہ سورۂ فاتحہ کی وسعتوں کو سمیٹ نہیں سکتی۔ سورۂ فاتحہ میں ہمیں اپنے رب کے اپنی شہ رگ سے نزدیک تر ہونے کا یقین اور احساس ہوتا ہے اور ہم اُس کی حمد بیان کرتے ہیں، اُس کی رحیمی اور رحمانیت کے سمندروں میں غوطہ زن ہوتے ہیں، روزِ آخرت میں بھی اس دنیا کی طرح اُس کی حاکمیت کا ادراک کرتے ہیں اور اُس سے مدد مانگتے ہوئے اُس کی عبودیت کا اقرار کرتے ہیں، یہ سورہ انسان کی روح کی دُعا ہے جو گمراہوں اور عتاب زدہ افراد سے الگ ہو کر اپنے لئے نجات و عافیت اور جنت طلب کرتی ہے۔

اُس وقت مسلمان دنیوی آسائشوں سے دور ایمان کی ڈوری کو پکڑتے ہوئے شرک کی تمام قوتوں کے خلاف نبرد آزما تھے اور انہیں رہبرِ دُنیا و دیں ﷺ کے ذریعے تسلی دی جارہی ہے کہ مال و متاعِ دُنیوی کا غم نہ کرو اور حضور ﷺ سے فرمایا جارہا ہے کہ تمہاری شفقت سب سے بڑی رحمت اور حالات کے سورج کے مقابل سایۂ رحمت ہے۔

زمانے کے مقابل تنہا، مگر اپنے ربّ کے ساتھ

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اسلام کی علانیہ تبلیغ حضور رسول اللہ ﷺ نے تنِ تنہا شروع کی۔ آپ میلوں اور بازاروں میں تشریف لے جاتے، باہر سے آنے والے زائروں اور تاجروں کے پاس

جاتے اور انہیں توحید کی دعوت دیتے۔ وہ بدبختِ ازلی جس کی ناکامی اور ''ہلاکت'' کی خبر قرآنِ مجید نے دی ہے آپ کے پیچھے پیچھے ہر مجمع میں پہنچ جاتا، آپ کا مضحکہ اُڑاتا اور اجنبیوں سے کہتا کہ اس شخص نے بھائی کو بھائی سے جدا کر دیا ہے، ہم میں تفرقہ پیدا کر دیا ہے، ہمارے معبودوں کا مذاق اُڑاتا ہے، اس کے پھندوں میں نہ پھنس جانا۔

نبی کریم ﷺ ابولہب اور دوسرے قریشیوں کی مخالفت کا سامنا انتہائی تحمل سے فرماتے اور باہر سے آنے والے آپ کے وقار، اخلاق اور تحمل کا موازنہ قریش کے طرزِ عمل سے کرتے اور یوں اُن کے دل حضور نبی کریم ﷺ کی دعوت کی طرف جھکنے لگتے۔ مخالفت کے اس طوفان میں نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام مسلسل حرم شریف جاتے رہے، خانۂ کعبہ کا طواف کرتے رہے، مقامِ ابراہیم پر نماز ادا کرتے رہے۔ عام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ہدایت تھی کہ وہ آپ سے دور رہیں، ہاں حضرت ابوبکر صدیقؓ جہاں تک ممکن ہوتا آپ کے ساتھ رہتے اور جب قریش کا طرزِ عمل ناقابلِ برداشت ہو جاتا تو آپ کی حفاظت اپنی سلامتی اور جان کی قیمت پر کرتے۔ صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ حضرت حمزہؓ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما اکثر مسجد الحرام پہنچ جاتے اور آئمۂ کفر کے سامنے کلمۂ حق ادا کرتے بلکہ حضرت حمزہؓ نے سرورِ کائنات کے ساتھ ابوجہل کی بدسلوکی اور گستاخی کی خبر سنتے ہی شکار سے واپسی پر حرم کا رخ کیا اور مجمعِ آئمۂ کفر میں پہنچ کر اپنی کمان ابوجہل کے سر پر اس زور سے ماری کہ کمان ٹوٹ گئی، اور آپؓ نے اعلان کیا کہ سن لو! حمزہ مسلمان ہو گیا ہے۔ اسی طرح حضرتِ عمرؓ کے مسلمان ہونے پر اہلِ ایمان نے اس زور سے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا کہ حرمِ کعبہ تک صدائے تکبیر پہنچ گئی۔

رسول اللہ ﷺ جب خانۂ کعبہ کا طواف کرتے تو سردارانِ کفر آپ کا تمسخر اُڑاتے، ایک دوسرے کو اشارے کرتے اور ٹھٹھے مار کر ہنستے۔ ایک دن قریش نے آنحضرت ﷺ کی پشت اور کندھوں کے درمیان خون آلود اوجھڑی اُس وقت ڈال دی جب آپ سجدے میں تھے اور آپ کا دم گھٹنے لگا۔ اُسی وقت حضرت فاطمہؓ تشریف لائیں اور اُس بوجھ کو اُٹھا کر آپ کے جسم سے الگ کیا۔ آپ کے جسم کو صاف کیا اور قریش کو برا بھلا کہا۔ رسول اللہ ﷺ نے نماز سے فارغ ہو کر اپنے ہاتھ دُعا کے لئے بلند کئے اور ہمیشہ کافروں کے لئے ہدایت کی دعا کرنے والے کے ہونٹوں سے تین مرتبہ یہ بددُعا بلند ہوئی کہ ''اے ربِّ کعبہ! قریش کو پکڑ لے۔ عمرو بن ہشام، عتبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، عمار بن ولید، اُمیہ بن خلف اور عقبہ بن ابی معیط کو پکڑ لے''۔ اور یومِ فرقان، یومِ بدر اُن کی پکڑ کا دن تھا۔ جب ان کے لاشے خاکِ بدر پر

پڑے ہوئے تھے، سورج کی بے مہر کرنیں عذابِ الٰہی بن کر اُن کو جھلسا رہی تھیں۔ اس دنیا ہی میں اُن پر ابدی عذاب کا آغاز ہو گیا تھا۔ یہ وہ تھے جن میں سے ایک نے آپ کے چہرۂ اقدس پر تھوکا تھا، ایک نے آپ کی گردنِ بلند پر اپنا پیر اس زور سے رکھا تھا کہ آپ کی آنکھیں جیسے حلقۂ چشم سے باہر نکل آئی تھیں، ان میں وہ تھا جس نے آپ کے چہرے اور سر پر مٹی ڈالی تھی، ان میں ایک وہ تھا جس نے آپ کی پشتِ مبارک پر اوجھڑی ڈالی تھی۔ یہ سب زمین کا بوجھ تھے اور زمین انہیں قبول کرنے سے انکار کر رہی تھی۔ آخر ان کے لاشے بدر کے کنوئیں میں پھینک دیئے گئے۔

حرمِ کعبہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جب ایسے ظلم کئے گئے تو آپ نے اُن ظالموں کو اُن کے انجام سے باخبر کر کے رسالت کا حق ادا کر دیا۔

ایک دن حضور نبی کریم ﷺ مقامِ ابراہیم پر نماز ادا کر رہے تھے تو عقبہ بن ابی معیط نے آپ کی گردن میں اپنی چادر ڈال کر اس زور سے کھینچی کہ آپ ﷺ زمین پر گر گئے اور قریش سمجھے کہ آپ اس دنیا سے رخصت ہو گئے، حضرت ابوبکر صدیقؓ اطلاع پا کر پہنچے اور اپنے رسول کو زمین سے اُٹھایا۔ حضور ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو آپؐ نے سایۂ کعبہ میں بیٹھے ہوئے آئمۂ قریش سے جا کر فرمایا کہ اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے کہ مجھے تمہاری طرف تمہیں ذبح کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اور آپ نے اپنے ہاتھوں کو اس طرح جنبش دی کہ جیسے کسی کو ذبح کیا جا رہا ہو، ابوجہل نے کہا کہ محمد! تم نادان تو نہیں ہو۔ کیا ہوا جو ایسی باتیں کر رہے ہو؟ آپ نے ابوجہل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم بھی ان ہی ذبح ہونے والوں میں سے ایک ہو۔

سردارانِ کفر کے ازدہام میں صرف اللہ کا رسول ہی اس لہجے میں بات کر سکتا تھا۔ صرف وہ انسان ہی ان کفرزادوں کو اُن کا انجام دکھا سکتا تھا جس کے ربّ نے اُس کے لئے مستقبل کے مناظر کو لمحۂ حال بنا کر پیش کر دیا ہو، جسے اُس کے ربّ نے یہ یقین دلا دیا ہو کہ تمہارا ربّ تمہیں لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔ المائدہ اگرچہ مدنی سورت ہے مگر اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی اس حفاظت کی یقین دہانی کا اظہار کیا گیا ہے جس سے آپؐ کے ربّ نے آپ کو تبلیغ کے ابتدائی دور ہی میں مطلع کر دیا ہو گا:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۲۴)

اے رسول! جو کچھ آپ کی طرف آپ کے ربّ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے،
اُسے (لوگوں تک) پہنچا دیجئے۔ اور اگر آپؐ نے ایسا نہیں کیا تو رسالت کا حق
ادا نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں (کی اذیت رسانی) سے محفوظ رکھے گا۔
بے شک اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔

اخلاقِ انسانی کا اہم نکتہ یہ ہے کہ اخلاقی صفات ایک دوسرے سے مربوط اور پیوستہ ہوتی ہیں، اور ان کے درمیان تناسب اور توازن کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ اس کے بغیر اخلاق ایک کُل نہیں بن سکتا۔ پھر اخلاقی صفات و اعمال میں مداومت کے بغیر کسی کے اخلاق کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ ایک سخی آدمی اہلِ ضرورت کا خیال رکھتا ہے، اُن کو خوب نوازتا ہے، لیکن اگر کسی وقت اُس کے مزاج میں برہمی ہے تو وہ اُنہیں سختی سے جھڑک دیتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اہلِ ایمان میں اپنی مثال اور اُسوۂ حسنہ سے اسی اخلاقی وکلیت کا سبق دیا ہے۔ آپ کا صبر، استقلال سے جڑا ہوا تھا، اور اس استقلال میں اقامت کا رنگ بھرا ہوا تھا۔ یہی استقلال، اقامت، شجاعت اور بہادری کی انتہائی صورت تھا۔ جب آئمۂ کفر کا جمگھٹا زیرِ سایۂ دیوارِ کعبہ، رعونت اور ظلم کی تصویر بنا بیٹھا تھا آپ ﷺ نے اُن کو بے خوفی کے ساتھ اُن کے ذبح کئے جانے کی خبر دی۔ اس شجاعت کا دوسرا پہلو آپ کا عفو و درگزر ہے۔ جب یہی جان کے دشمن فتحِ مکہ کے دن سر جھکائے، دھڑکتے دل کے ساتھ آپ ﷺ کے فیصلے کے منتظر تھے تو آپ ﷺ نے اُنہیں لاتثریب علیکم الیوم کی بشارت دی۔

توازن کی صفت آنے والے صفحات میں، آپ ﷺ کی دوسری اخلاقی صفات کے تذکرے کے ساتھ روشن تر ہوتی جائے گی۔ ہم ابتدائی مکی دور میں آپ کے صبر اور حق کی راہ میں آپ کی قربانی اور سب کچھ نثار کرنے کے باب میں صرف ایک اور واقعہ پیش کرنے کے بعد صحابۂ کرامؓ کے صبر کی چند مثالیں پیش کریں گے، کیونکہ صحابۂ عظامؓ کا صبر بھی آپؐ کے اُسوۂ حسنہ کا ایک نقش اور آپ ﷺ کے صبر کا پرتو ہے۔ اس واقعے سے ہم پر یہ حقیقت بھی اپنی تمام معنویت اور پہلوؤں کے ساتھ واضح ہو جاتی ہے کہ:

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (۲۵)
نبی (ﷺ) مومنوں پر خود اُن کی ذات سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔

اس قرآنی ارشاد سے اس حدیث کے معانی کا ہر گوشہ منور ہو جاتا ہے:

لایومنُ احدکم حتیٰ اکون احبَّ الیه من والده وولده والناس

اجمعین (۲۶)

تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اُسے اپنے والدین، اپنی اولاد، تمام انسانوں حتیٰ کہ اپنی ذات سے زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں۔

اس واقعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ''ثانی اثنین اسلام و غار و بدر و قبر'' نے کس طرح حبِ رسول کو مومن کی زندگی کی حقیقت بنا دیا تھا۔ ایک دن حرمِ کعبہ میں قریش کے سرداروں نے نبیٔ اکرم ﷺ کی تبلیغی گفتگو کو روکنے کے لئے ہر طرف سے آپ کو اپنے نرغے میں لے لیا اور چادر ڈال کر آپ کا گلا گھونٹنے لگے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ تھے۔ اُنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو بچانے کے لئے قریش کے سرداروں کو دھکا دینا اور پیچھے ہٹانا شروع کیا۔ آپ روتے جاتے اور کہتے جاتے کہ تم اس شخص کو صرف اس لئے ہلاک کرنا چاہتے ہو کہ یہ کہتا ہے کہ اللہ میرا رب ہے۔ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی مزاحمت سے کافروں کے غصے میں اضافہ ہوتا گیا۔ عقبہ بن ربیعہ نے پرانے اور سخت تلوے والے جوتے سے آپؓ کے چہرۂ مبارک پر اتنی ضربیں لگائیں کہ چہرہ خون میں ڈوب گیا، اور ورم کی وجہ سے خدوخال پہچانے نہ جاتے تھے:

بنی تمیم آپ کو بے ہوشی کے عالم میں اُٹھا کر لے گئے۔ موت ابوبکرؓ کو چھو کر گزر گئی۔ گھنٹوں کے بعد جب ہوش آیا تو جو لفظ زبان سے ادا ہوئے وہ یہی تھے کہ رسول اللہ تو خیریت سے ہیں؟

آپ کو اپنی قبائلی حمیت کی بنا پر بچا کر لانے والے عمائدِ بنو تمیم برا بھلا کہنے لگے کہ دیکھو اپنی پروا نہیں، اُسی کا ذکر ہے جس کی وجہ سے اس حال کو پہنچے۔

اُمِ جمیل مسلمان ہو چکی تھیں۔ وہ جب قریب آئیں تو اُن سے بھی یہی سوال کیا۔ اُنہوں نے اشارے سے کہا کہ کیسے بتاؤں، آپ کی والدہ سن لیں گی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ ان کے سامنے بتا دو، کوئی بات نہیں، اُمِ جمیل نے حضور ﷺ کی خیریت سے مطلع فرمایا تو بے ساختہ الحمدللہ کہا۔ جب (حضرت ابوبکرؓ کو) کوئی مشروب پیش کیا گیا تو جانثارِ محمدِ عربی ﷺ نے انکار کر دیا اور کہا کہ اللہ کے حضور میری یہ نذر ہے کہ چہرۂ زیبائے رسول اللہ کو دیکھے بغیر نہ کچھ کھاؤں گا نہ پیوں گا۔ جب قبیلے والے چلے گئے تو اپنی والدہ اور اُمِ جمیل کا سہارا لے کر ہزار دقت سے اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے۔ ابوبکرؓ کی وفاداری کے اس نقش کو دیکھ کر سرکارِ ختمی مرتبت کی آنکھوں میں موتی چمکنے لگے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کی وہ لکیر نمودار ہوئی جس میں مستقبل کے پردے میں چھپی ہوئی اسلام کی ساری

کامیابیوں اور فتوحات کی روشنی تھی۔ صاحبِ خلقِ عظیم ﷺ نے حضرتِ صدیق اکبرؓ کی والدہ کا شکریہ ادا کیا اور یہی وہ لمحہ تھا کہ اُن کا دل اسلام کے لئے کھل گیا اور وہ مسلمان ہوگئیں۔ (۲۷)

دارِ ارقم..... پہلا دارالاسلام

نبوت کے تیسرے سال تک اسلام قبول کرنے والے حرمِ کعبہ میں، بازاروں میں، مکۂ معظمہ کی وادیوں میں ایک دوسرے سے ملتے اور چھپ کر عبادت کرتے۔ تبلیغ کا تیسرا سال تھا حضرت ارقم بن الارقم کا وجود نورِ ایمان سے منور ہوگیا۔ اُن کا مکان عام رہ گزر اور بستی سے الگ کوہِ صفا کے قریب تھا۔ اُنہوں نے اپنا مکان نبی کریم ﷺ اور اسلام لانے والوں کے لئے وقف کر دیا۔ یہ دارالکفر میں پہلا ''دارالاسلام'' تھا۔ حضرت ارقم بن الارقم ساتویں یا گیارہویں مسلمان تھے۔ ان آٹھ دس نفوسِ قدسیہ کو حضور نبی کریم ﷺ کی صحبتِ کردار ساز کے لئے سکون کی گھڑیاں نصیب ہونے لگیں۔ دارالارقم کی فیض بار اور ایمان آثار فضاؤں میں سعید روحیں آتیں اور دستِ رسالت مآب ﷺ پر بیعتِ ایمان کرتیں۔ اس مختصر سے گھر میں آیاتِ قرآنی کی مسلسل صدا ایک نغمۂ ابد کی طرح گونجتی، اللہ کے ذکر سے قلوب زندہ تر ہوجاتے، اور ان بندگانِ رب اور اُن کے رب کے درمیان دوسروں کی مداخلت کم سے کم تر ہوتی گئی، ورنہ اس سے پہلے جنگ و جدال کے امکانات آسانی سے پیدا ہوجاتے۔ ایک بار صحابۂ کرام ایک پہاڑ کی گھاٹی میں نماز ادا کر رہے تھے کہ کافروں کے ایک گروہ نے دیکھ لیا، تمسخر اور ٹھٹھول شروع کر دیا یہاں تک کہ ایذا رسانی تک پہنچ گئے۔ جماعتِ صحابہ رضی اللہ عنہم ہر تکلیف کا صبر سے مقابلہ کرسکتی تھی، مگر گروہِ مشرکین نے اسلام اور نبیٔ اکرم ﷺ کے بارے میں کچھ نازیبا کلمات ادا کئے۔ اس پر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ایک کافر کو اُونٹ کی ایک بڑی ہڈی سے ضرب لگائی اور اُس کا سر پھٹ گیا۔ یہ اسلام کے راستے میں جہاد کا ''نقطۂ آغاز'' تھا۔

دارِ ارقم مسلمانوں کے لئے ایک پناہ گاہ کا درجہ رکھتا تھا، لیکن معاشرے سے کلیتہً بے تعلق ہوکر وہاں رہنا ممکن نہیں تھا۔ پھر ان اولین مسلمانوں میں سے کئی مشرکین کے غلام تھے۔ یہ مشرک مسلمان ہونے کی ''سزا'' کے طور پر اُن پر ظلم کے پہاڑ توڑتے تھے۔ اس سلسلے میں پہلا نام جو ذہن میں آتا ہے وہ حضرتِ بلال حبشی کا ہے۔ حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کا تعلق اگرچہ قبیلۂ تمیم سے تھا، لیکن غلام بنا کر مکۂ معظمہ میں بیچ دیئے گئے تھے۔ حضرت صہیب رومی بھی غلام بنا کر مکہ معظمہ میں بیچے گئے تھے۔

حضرت یاسر، حضرت عمار اور حضرت عمار کی والدہ حضرت سمیہ بھی عرب معاشرے کے مظلوم طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان سب پر ان کے مالکوں نے ظلم وستم ایجاد کئے۔ ان کے علاوہ عرب کے معزز گھرانوں کے جو نوجوان مسلمان ہوئے، اُن کے عزیزوں نے انہیں راہِ حق سے ہٹانے کے لئے طرح طرح کے آزار دیئے۔ اُن کے مظالم اور ان مسلمانوں کا صبر تاریخ انسانیت میں صبر اور ثابت قدمی کا عظیم باب ہے۔ اولین مسلمانوں میں سے سب سے زیادہ عمر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تھی۔ وہ رسول اللہ ﷺ سے دو ایک سال چھوٹے تھے۔ باقی مسلمانوں کی عمریں اوسطاً تیس سال سے بھی کم تھیں۔ یہ وہ متلاشیانِ حق تھے جن کے مالی، معاشی اور کسی طرح کے مفادات خطرے میں نہیں تھے جو اُنہیں قبولِ حق سے روک سکتے۔ راہِ حق میں ان کے صبر واستقلال اور ہمت کو تاریخ نے اپنی پیشانی پر لکھ لیا ہے۔ تاریخ وسیرت اور طبقات الصحابہ سے متعلق کتابوں کے مطالعے سے یہ ایمان افزا مجرا ہمارے سامنے آتا ہے۔ قارئینِ کرام سے درخواست ہے کہ قرآنِ مجید کی تلاوت اور ایمانیات کے بارے میں کتابوں کے علاوہ وہ سیرت النبیؐ اور حیاتِ صحابہؓ پر مشتمل کتابوں کا پابندی سے مطالعہ کیا کریں تاکہ ہمارے معیاری نمونے (رول ماڈل) ہمارے سامنے رہیں۔ جناب محمد یوسف کاندھلوی علیہ الرحمہ کی کتاب حیات الصحابہؓ کی تینوں جلدوں کا ترجمہ اُردو میں ہو چکا ہے۔ مترجم ہیں مولانا محمد احسان الحق۔ اسے اپنے مطالعے کی بنیادی کتابوں میں شامل کر لیجیے۔

صحابہ کرامؓ کا صبر

ہم اس دورِ آزمائش وابتلا کے چند واقعات پیش کر رہے ہیں۔ ان سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ ایمان کے مقابل جانِ عزیز کی کوئی قیمت نہیں۔ سابقین الاولین نے اپنی زندگی کی قیمت پر اسلام کو اپنایا۔

حضرتِ عمارؓ، اُن کے والد حضرت یاسر رضی اللہ عنہما اور اُن کی والدہ حضرت سمیہ کو اُن کے آقا پتھریلی اور ریتیلی زمین پر گرمیوں کی دوپہر میں ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دیتے۔ ایک دن جب وہ یہ اذیت برداشت کر رہے تھے تو رحمتِ عالم ﷺ کا اُدھر سے حضرت عثمانؓ کے ساتھ گزر ہوا۔ اپنے رسول اور ہادی کو دیکھ کر حضرت یاسرؓ کے ہونٹوں پر یہ فریاد اُبھری کہ یارسول اللہ! (ﷺ) کب تک۔ کیا ہم مرنے تک یوں جئیں گے۔ سرکارِ دوعالم ﷺ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ آپ نے مظلوم سے کہا اے آلِ یاسر صبر واور اپنے رب سے دُعا فرمائی۔ بارِ الٰہا! آلِ یاسر کی مغفرت فرما۔ یہ دونوں جملے نبوت کے معجزے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک طرف مظلوم کی ہمت افزائی اور دوسری طرف ربِ کائنات سے مغفرت کی دعا۔

مغفرت کی دُعا میں عقبیٰ کے ساتھ ساتھ دُنیا بھی شامل ہے کہ ظلم سے نجات ملے۔

ابوجہل کی پوری زندگی ایک مسلسل تاریکی تھی لیکن اُس کے سیاہ تر کرتوتوں میں یہ بھی ہے کہ اُس نے حضرت سمیہؓ کی شرم گاہ میں اس بے رحمی سے نیزہ مارا کہ وہ شہید ہوگئیں۔ اسی طرح حضرت یاسرؓ بھی اذیتوں کی تاب نہ لاکر اپنے ربّ کے حضور پہنچ گئے۔ یہ وہ شہیدانِ وفا تھے کہ مرتے وقت اُن کے لبوں پر یہ کلمہ ہوتا کہ ''ربّ کعبہ کی قسم! ہم نے اپنی مراد پالی''۔

مشرکینِ قریش کے اپنے رواج اور دستور تھے۔ اُن میں یہ دستور بھی تھا کہ قبیلے اپنے افراد کی حفاظت کرتے اور اس طرح کہ دوسرے قبیلے والے اُن پر ہاتھ اُٹھانے کی ہمت نہ کر سکتے تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے سلسلے میں ہم اس کا ذکر کر چکے ہیں۔ غلاموں کا معاملہ مختلف تھا جس کا اندازہ حضرت یاسر اور حضرتِ سُمیہ رضی اللہ عنہما کی شہادت سے ہوسکتا ہے۔

حضرت یاسر، حضرت عمار، حضرت سُمیہ رضی اللہ عنہم کی طرح حضرت بلال حبشی، حضرت صہیب رومیؓ اور حضرت مقداد کو کسی قبیلے کی حمایت حاصل نہیں تھی۔ قریش اُس موسم میں جب زمین اور آسمان تپ رہے ہوتے، انہیں لوہے کی زرہیں پہناتے اور انہیں سخت دھوپ میں ہاتھ پیر باندھ کر رسیوں سے جکڑ کر ڈال دیتے۔ ان سب نے اپنے اپنے طور پر اس ظلم کا سامنا کیا لیکن بلال رضی اللہ عنہ نے تو اپنے لہو سے ایسا گلستان تعمیر کیا جس میں حبِّ محمدِ عربی ﷺ کے جاوداں پھول اب تک مہک رہے ہیں۔ مشرکوں نے حضرت بلالؓ کو اپنے اوباش نوجوانوں کے سپرد کر دیا جو اُنہیں آہنی زرہ بکتر میں ملبوس مکّے کی گلیوں میں کھینچتے پھرتے مگر مشرکینِ مکہ کو حد درجہ پشیمانی اور پریشانی ہوئی کہ بلال رضی اللہ عنہ کی زبان سے ایک بار بھی اُف اُف کی آواز نہ سنائی دی اور اُن کے لبوں سے اَحَدٌ، اَحَدٌ کا ترانہ اُبھر کر فضا کو منور اور معطر کرتا رہا۔ بلالؓ ایک فرد کا نام نہیں بلکہ ظلم کے مقابل انسانی برداشت کا نام ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لفظ بلال ایک نعرۂ حق بن گیا ہے جو ظلم کی ہر رات میں روشنی حق سے چراغاں کرتا ہے۔

آخر ایک دن اُمیہ بن خلف اور ابوجہل وغیرہ حضرت بلالؓ کو طرح طرح سے اذیتیں دے رہے تھے، اُدھر سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا گزر ہوا تو اُنہوں نے ان ظالموں پر نفریں کی۔ جواب میں اُمیہ نے کہا کہ اگر اس کا اتنا ہی درد ہے تو اس نکمّے کو خرید کیوں نہیں لیتے۔ حضرت صدیقؓ نے کہا کہ یہ اتنا قیمتی ہے کہ تم اس کی جو قیمت لگاؤ گے، مجھے منظور ہوگی اور یوں اُسؓ نے جس کا لقب عتیق تھا، حضرت بلالؓ کو اس جہنم عذاب سے نجات دلائی۔ پندرہ صدیاں ہونے کو آئیں، مگر بلال رضی اللہ عنہ کا نام آج تک وفا اور

استقامت کا مترادف ہے:

راہِ وفا میں پھول کھلائے بلالؓ نے
اپنے لہو سے خود کو گلستاں کئے ہوئے

حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ نے آلِ یاسر اور حضرت بلالؓ کی طرح اسلام قبول کرنے کی پاداش میں بے حد اذیتیں برداشت کیں۔ ایک دن مشرکوں نے آگ دہکائی اور اس پر حضرت خباب کو لٹا دیا، اور آخر یہ آگ خباب کی چربی پگھلنے سے ٹھنڈی ہوئی۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی تھی کہ چربی سے آگ اور بھڑکنے کی بجائے بجھ گئی۔

یہ ظلم وستم بے سہارا غلاموں تک محدود نہ تھا، بلکہ مکّے کے معزز خاندانوں کے جو نوجوان مسلمان ہوگئے تھے اُن کے بزرگ والد، چچا اور دوسرے فرد بھی انہیں دین آباء میں واپس لانے کے لئے قید وبند، تعزیر اور ظلم سے کام لیتے، لیکن اسلام کا سُرور ایسا نہیں تھا جو ان حربوں سے اُتر جاتا بلکہ یہاں تو ''ذوقِ جرم'' ہر سزا کے بعد بڑھتا تھا۔ حضرت عثمان بن عفانؓ مسلمان ہوئے تو اُن کے چچا حکم ابوالعاص بن اُمیہ نے ایسی رسیوں سے اُنہیں باندھ دیا کہ ہر گرہ کھال کو کاٹتی ہوئی گوشت میں اُترتی جاتی، اور چچا نے کہا کہ اپنے معبودوں کی قسم! جب تک تم اُن کو ماننے اور اُن کی عبادت کے لئے تیار نہیں ہوگے، ان رسیوں کی بندش یوں ہی تمہارے جسم میں پیوست ہوتی رہے گی۔ بھتیجے کا جواب تھا کہ ربِّ کعبہ کی قسم! وہ گھڑی کبھی نہیں آئے گی۔ اور آخر بھتیجے کا قول کُرسی نشین ہوا اور ظالم چچا کو رسیاں کھولنی پڑیں۔

ایک دن صفا ومروہ کے درمیان سعی کرتے ہوئے حضرت مسعود بن حراشؓ نے دیکھا کہ ایک نوجوان کے ہاتھ اُس کی گردن کے ساتھ بندھے ہوئے تھے اور اُس کو کچوکے دینے والوں اور برا بھلا کہنے والوں کا ہجوم اُس کے گرد ہے۔ ان لوگوں میں ایک عورت بھی تھی جو بدزبانی اور برا بھلا کہنے والوں میں سب سے آگے تھی۔ میں نے معلوم کیا کہ معاملہ کیا ہے؟ تو معلوم ہوا کہ یہ نوجوان طلحہ بن عبیداللہ ہے اور اُس کو گھیر کر اذیت دینے والے اُس کے اعزا ہیں، جو چاہتے ہیں کہ طلحہ اسلام سے اپنی برّیت کا اعلان کردیں، اور یہ عورت طلحہ کی ماں ہے، جس کی مامتا نفرت کی آگ میں جل بجھی۔ (جاری ہے)

حوالہ جات

۱۔ النساء:۱۲۸
۲۔ ایضاً
۳۔ شبلی نعمانی/ سیرت النبی/ دار الاشاعت، کراچی/ ج۱،ص۳۰۰
۴۔ حلبی/ انسان العیون/ دار المعرفہ بیروت/ ج۱،ص ۲۲۹۔ابن سید الناس/عیون الاثر/ مکتبہ دار التراث، مدینہ منورہ،۱۹۹۲ء/ ج۱، ص۲۷۰
۵۔ مثلاً آل عمران:۱۳۷، انعام:۱۱، نحل:۳۶،
۶۔ ترمذی السنن/ دار الفکر، بیروت ۱۹۹۴ء/ ج۵،ص۳۵۷،رقم۳۶۴۰
۷۔ بخاری/ مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر۱۹۵۳ء/ ج۱،ص۴
۸۔ العلق:۱
۹۔ المدثر:۴،۷
۱۰۔ الاعراف:۲۶
۱۱۔ مفتی محمد شفیع/ معارف القرآن/ ج۸،ص۶۱۲
۱۲۔ التوبہ:۱۰۰
۱۳۔ الواقعہ:۱۰تا۱۴
۱۴۔ الحجر:۹۴تا۹۹
۱۵۔ النصر
۱۶۔ بخاری/ ج۳،ص۱۵۹
۱۷۔ اللہب:۱
۱۸۔ ہود:۸۴تا۸۷
۱۹۔ المومن:۵۵
۲۰۔ البقرۃ:۴۵
۲۱۔ العصر
۲۲۔ الحجر:۹۴
۲۳۔ الحجر:۸۷اور۸۸
۲۴۔ المائدہ: ۶۷
۲۵۔ الاحزاب:۶
۲۶۔ احمد /المسند/ دار احیاء التراث العربی، بیروت،۱۹۹۳ء/ ج۴،ص۱۸۳،رقم۱۳۴۹۹
۲۷۔ سید ابوالخیر کشفی/ حیات محمد صلی اللہ علیہ وسلم، قرآنِ حکیم کے آئینے میں/ دادا بھائی فاؤنڈیشن،کراچی،۱۹۹۱ء/ص۱۰،۱۱

ندائے سحر

حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاںؒ

مختلف اسلامی موضوعات پر ریڈیو تقاریر کا قیمتی مجموعہ

صرف 100 روپے منی آرڈر کے ذریعے ارسال فرما کر رجسٹرڈ ڈاک سے کتاب گھر بیٹھے حاصل کیجئے

زوار اکیڈمی پبلی کیشنز: اے۔۴/ ۱۷، ناظم آباد نمبر۴۔کراچی۔74600فون: 021-6684790